کیمیاگر

اور

دوسرے افسانے

مصنّفہ

پروفیسر محمد مجیب بی۔اے۔ (آکسن)

مکتبہ جامعہ

دہلی، نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ، بمبئی ۳

سوم ۱۰۰۰

مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی

کیمیاگر

اور

دوسرے افسانے

دیباچہ

افسانہ نویسی کا فن ہندوستان میں عام ہو گیا ہے اور اسی کے ساتھ مقدمہ نویسی کا بھی۔ ناظرین غالباً اس کی توقع نہ کرتے ہوں گے کہ میں افسانوں کے اس مجموعے کو شائع کرنے کی معذرت چاہوں، اور نہ انھیں یہ معلوم کرنے کی فکر ہو گی کہ میں نے یہ افسانے کیوں لکھے۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ اپنا تعارف کسی دوست یا سرپرست کے قلم سے کراؤں، لیکن مجھ سے کہا گیا کہ مقدمہ لکھوانا بہت خطرناک ہے، اگر وہ دلچسپ ہوا تو لوگ اسی کو پڑھ کر رہ جائیں گے اور اگر اس میں خدانخواستہ افسانوں کی تعریف ضرورت سے زیادہ کی گئی تو ناظرین ضد میں آ کر جو دو ایک پڑھنے کے لائق ہیں انھیں بھی برا کہنے لگیں گے۔ اس لئے میں خود ہی اپنا مقدمہ نویس بن گیا ہوں اور جو دو چار باتیں عرض کرنی ہیں وہ خود ہی بیان کئے دیتا ہوں۔

ان افسانوں میں سے دو "پتھر" اور "باغی" آٹھ سال ہوئے جرمنی میں انگریزی زبان میں لکھے گئے تھے، انھیں کو پڑھ کر مدیر "جامعہ" نے رسالے کے لئے افسانوں کا تقاضا شروع کیا اور کچھ میری خواہش اور کچھ ان کے اصرار سے "نیا مکان"، "اندھیرا"، "کیمیاگر"، "خاں صاحب"، "باغباں" اور "چراغِ راہ" لکھے گئے۔ پہلے دو افسانوں کی تصنیف کے وقت میرے ذہن پر یورپی اور خصوصاً روسی انشاپردازوں کا بہت اثر تھا اور وہ اثر کسی قدر اب بھی باقی ہے مگر میں نے کسی مغربی یا روسی مصنف کی نقل نہیں کی ہے نہ کسی کا طرز اختیار کیا ہے۔ جو اثرات مجھ پر پڑے ہیں، انھوں نے مجھے سکھایا کم ہے سجھایا زیادہ ہے اور وہ ان افسانوں میں ظاہر بھی ہو گئے ہیں۔ میں نے دلچسپ کہانیاں سنانے کی کوشش نہیں کی ہے، نہ کسی کی سرگذشت بیان کر کے اس سے اخلاقی نتائج اخذ کئے ہیں۔ میرا اصول یہ ہے کہ معمولی گفتگو اور معمولی واقعات کے ذریعے سے قصے کے اشخاص کی سیرت پر روشنی ڈالی جائے اور ان کی زندگی کا ایک ہی واقعہ اس طرح بیان کیا جائے کہ پڑھنے والے کی آنکھوں میں ان کی پوری زندگی کی تصویر پھر جائے۔ یہ سوال کہ ان افسانوں کے اشخاص کی اخلاقی اور معاشرتی قدر کیا ہے ناظرین خود طے کر لیں گے۔ میں نے اخلاقی اور فلسفیانہ مسائل کو حل کرنے کی جرأت نہیں کی ہے اور اسی کے ساتھ ناظرین کو دور از کار

جذبات اور بے اصل خیال آرائی کا طلسم دکھانے سے بھی پرہیز کیا ہے۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس مجموعے میں مروجہ طرز کی کوئی عشقیہ داستان نہیں ہے، رسمی حسن و عشق کی داستانیں سینکڑوں کے حساب سے ماہانہ رسالوں میں چھپتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس مجموعے میں ان کی عدم موجودگی سے کسی کو شکایت نہ ہوگی، مگر میں نے عاشق مزاج مردوں، حسین عورتوں، لطیف جذبات اور رنگین زندگی کی تصویر دکھانے سے پرہیز صرف اس خیال سے نہیں کیا ہے کہ یہ ماہوار رسالوں کا خاص موضوع ہے۔ مجھے حسن و عشق کے لطیف جذبات ایک اور ہی شکل میں نظر آتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی شکل سب سے زیادہ صحیح، پائدار اور دلکش ہے۔ میں انسان کے دل کو اتنا تنگ بھی نہیں فرض کرتا ہوں کہ اس میں ایک جذبۂ لطیف کے سوا اور کچھ نہ سما سکے اور جب انسان کا دل وسیع ہے تو اس کے ذہن اور مذاق میں بھی وسعت ہونی چاہیے۔ مگر یہ بحث بہت لمبی ہے۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ اس موقع پر اسے چھیڑنے سے میں اپنا نظریہ ثابت کرنے کے بجائے ناظرین کو اس کی طرف سے بدظن کردوں گا، کیونکہ یہ افسانے ہرگز اس لائق نہیں ہیں کہ جمالیات کے کسی نظریے کے ثبوت میں پیش کیے جائیں۔

آخر میں مجھے اپنے دوست ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ ان کے احسانات کا خیال کرتا ہوں تو شیخ سعدی کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد　　　　دگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

جامعہ ملیہ اسلامیہ
۳۰ ستمبر ۱۹۳۲ء

محمد مجیب

کیمیاگر

حکیم مسیح ترکستان سے اپنی بوڑھی ماں کو ساتھ لے کر ہندوستان آئے تھے، دہلی پہنچے تو انھیں حکم ملا کہ جون پور کی طرف کچھ اور نو وارد ترکی خاندانوں کے ساتھ ایک بڑے گاؤں میں جس کا خالد پور نام رکھا گیا تھا، مسلمان آبادی کی بنیاد ڈالیں۔ حکیم مسیح نے حکم کی تعمیل کی اور خالد پور میں جا بسے۔ رفتہ رفتہ دوسرے خاندان بھی آگئے اور مسلمانوں کی ایک مستقل آبادی ہوگئی۔ حکیم مسیح نے دنیا کے تقریباً تمام مشہور طبیبوں کی شاگردی کی تھی اور اپنے فن میں ماہر تھے، اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ وہ تھوڑے دنوں میں آس پاس مشہور ہوگئے، اور ترکستان میں ان کے خاندان نے جو کچھ کھویا تھا وہ ہندوستان میں انھیں واپس ملنے لگا۔ ان کی ماں نے ایک ترکی رئیس کی بیٹی سے ان کی شادی بھی کرادی، جس سے انھیں شرافت اور سرمایہ داری کا تمغہ مل گیا۔

حکیم مسیح نہایت حسین، خوش مزاج اور شائستہ آدمی تھے۔ دنیا کی مصیبتیں ان کی طبیعت میں ذرا ترشی یا تلخی نہیں پیدا کرسکی تھیں۔ وہ اونچا نیچا دیکھ چکے تھے، خود ہمدردی کی تلاش میں رہ چکے تھے اور اب ہر ایک سے اچھا سلوک کرنے پر تیار رہتے تھے۔ تجربے نے انھیں انسان کی فطرت کے بھید بتا دیے تھے۔

انھیں معلوم تھا کہ محبت سے بات کرنے کا کیا اثر ہوتا ہے، مریض کو دوا سے کتنا فائدہ پہنچتا ہے اور طبیب کے اخلاق سے کتنا۔ ان کا برتاؤ بیماروں اور تیمارداروں کے ساتھ ایسا تھا کہ لوگ محض ان کی توجہ کو کافی سمجھتے تھے۔ لیکن وہ مرض کی تشخیص بھی بہت سوچ سمجھ کر کرتے تھے اور دوائیں نہایت احتیاط سے اکثر اپنے سامنے تیار کراتے تھے، یہاں تک کہ ان کی ناکامی کی وجہ علاوہ تقدیر کے اور کوئی نہیں سمجھی جاتی تھی۔

لیکن حکیم مسیح باوجود اپنی ہر دل عزیزی اور شہرت کے اپنی زندگی سے مطمئن نہ تھے، کچھ اپنے وطن کی یاد بے چین کرتی تھی کچھ ہندوستان کی فضا۔ مگر سب سے زیادہ انھیں یہ خیال ستاتا تھا کہ اب وہ دنیا جتنی دکھنی تھی دیکھ چکے ہیں، کیونکہ ہندوستان سے واپس جانا ممکن نہیں اور وہ یہیں مریں گے اور یہیں دفن ہوں گے۔ ان کا دل ہر قسم کے تعصب سے پاک تھا، لیکن پھر بھی وہ ہندوؤں کو نہ اپنے جیسے آدمی سمجھ سکتے تھے، نہ ہندوستان کو اپنے وطن جیسا ملک۔ ان پر کچھ اثر ان کی بیوی اور ان کی سسرال کا بھی تھا۔ یہ لوگ کسی مجلس کو بغیر اپنے ملک کی یاد میں نوحہ خوانی کیے نہیں برخاست کرتے تھے اور بغیر ہندو قوم اور ہندو مذہب پر لعنت بھیجے کسی مسئلے پر گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ حکیم مسیح کو ہندوؤں سے اس قدر سابقہ پڑتا تھا اور ہندو ان کی اس قدر عزت، ان سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ ان کا اپنی سسرال والوں کا ہم خیال ہونا ناممکن تھا، لیکن ان لوگوں کے تعصب کا اتنا تو اثر ضرور ہوا کہ حکیم مسیح نہ ہندوؤں میں اس طرح گھل مل سکے جیسا کہ ان کی فطرت کا تقاضا تھا اور نہ ہندوستان کے زمین

آسمان کو اپنا وطن بنا سکے۔ عزت اور شہرت حاصل کرنے پر بھی ان کو اس کا ارمان رہ گیا کہ ایک دم بھر کے لیے بھی طبیعت میں سکون پیدا کر سکیں، اپنی زندگی کو مستقل یا اپنے گھر کو گھر سمجھ سکیں۔

یوں ہی دن گذرتے گئے، حکیم مسیح کی ماں کا انتقال ہوگیا اور وہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہوئیں جو آبادی کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا لیکن حکیم مسیح کو کسی طرح سے یقین نہ آسکا کہ ہندوستان میں ان کی نسل نے جڑ پکڑ لی ہے، اور ان کی روحانی بے چینی انھیں پریشان کرتی رہی۔

"کاش مجھے ایک ایسا کیمیا گر ملتا" انھوں نے اپنی بیوی سے ایک دن کہا "جو میری فطرت میں اس سرزمین سے مناسبت پیدا کر دیتا۔ آخر میں کب تک اپنے آپ کو مسافر یا مہمان سمجھتا رہوں گا۔"

اس کے جواب میں ان کی بیوی نے آنکھیں نکالیں اور طنز سے کہا:۔

"جب جوانی تھی تو ہمت ہارے بیٹھے رہے۔ اب بڑھاپے میں کیمیا گر کی تلاش ہے۔ جو ارادے کا کمزور ہو اس کی مدد کرنا قادرِ مطلق کے امکان سے بھی باہر ہے۔"

حکیم مسیح مسکرائے، ایک ٹھنڈی سانس بھری اور خاموش ہو گئے۔

اس گفتگو کے کچھ دن بعد ہی ان کے مطب میں ایک ہیضے کا مریض لایا گیا۔ حکیم صاحب نے اس کے لئے تو نسخہ لکھ دیا لیکن اپنے گھر کہلا بھیجا کہ خالد پور میں ہیضے کا اندیشہ ہے اور سب کو فوراً سفر کی تیاری کرنا چاہیئے۔ ان کے گھر سے دوسرے مسلمان گھرانوں میں خبر پہنچائی گئی اور ساری بستی میں کھلبلی مچ گئی۔ جب

حکیم مسیح کے پاس شام تک اور مریض بھی پہنچے اور انھوں نے یہ اطلاع دی کہ وبا کا حملہ غالباً شدید ہونے والا ہے تو سب نے اسی رات بستی چھوڑ دینے کا تہیہ کر لیا۔ حکیم مسیح خود خالد پور میں ٹھہرنے کا ارادہ کر چکے تھے اور انھوں نے اپنی بیوی کو اس کی مصلحتیں سمجھانے کی بہت سی دلیلیں سوچ لی تھیں۔ مگر ان کی بیوی ان سے زیادہ دور اندیش ثابت ہوئیں اور جب وہ مغرب کے قریب قریب گھر کے اندر گئے تو انھوں نے دیکھا کہ تمام نوکر چاکر بوکھلائے ہوئے اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں اور ان کی بیوی رو پیٹ رہی ہیں۔ پہلے تو انھیں یہ شبہہ ہوا کہ شاید گھر میں کوئی ہیضے کا شکار بنا ہے مگر جب بڑی دقت سے انھوں نے واقعہ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ انھیں کا ماتم ہو رہا ہے۔ اُن کی بیوی نے محض اس اندیشے میں کہ وہ خالد پور چھوڑنے سے انکار کریں گے صرف خود رونا دھونا نہیں شروع کر دیا تھا بلکہ تمام محلے والوں اور عزیزوں سے اُن کی اس حماقت کی شکایت بھی کی تھی اور ہر ایک کو رو رو کر اُن کے ارادے کی مخالفت پر آمادہ کر لیا تھا۔ حکیم مسیح کھڑے تدبیریں سوچ رہے تھے کہ اُن کے خسر اور سالے آ گئے اور انھیں گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ باری باری سے ایک سمجھاتا اور دُوسرا ڈانٹتا تھا اور دونوں اس قدر گھبرائے ہوئے تھے کہ بہت دیر تک حکیم مسیح کو پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کہہ کیا رہے ہیں لیکن وہ تو حکیم مسیح کو بات سمجھنے اور جواب سوچنے کا موقع ہی نہیں دینا چاہتے تھے، اور قبل اس کے کہ حکیم مسیح زبان ہلا سکیں دونوں نے اُن کے ہاتھ پکڑ لئے، خدا اور رسول ؐ اور مسلمانوں کی جانوں کی قسمیں دلائیں؛ ان کی جوان بیوی اور ننھے بچوں کی حفاظت کا فرض یاد دلایا اور آخر میں ہندو قوم پر لعنت بھیجی اور کہا کہ وہ اسی قابل ہے کہ دق اور ہیضے میں ہلاک ہو اور کسی مسلمان کو اس کو بچانے کے لئے اپنی جان خطرے میں

نہ ڈالنی چاہیے۔

اب حکیم مسیح سمجھے کہ اس عجیب و غریب تقریر کا مقصد کیا ہے اور انھوں نے جو دلیلیں اپنی بیوی کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے سوچ رکھی تھیں اُن سے کام لینا چاہا مگر اُن کے خسر اور سالے نے ان کی ذرا سی خاموشی کو رضامندی قرار دیا اور چلا اُٹھے:۔

"ارے وہ بیچارہ تو کچھ کہتا ہے نہیں۔ وہ خود جانے پر تیار ہے۔"

حکیم مسیح پھر کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن ان کی بیوی جو اپنے فریق کو مضبوط پا کر ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھیں کہنے لگیں:۔

"آپ لوگوں کے کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے اطمینان اسی وقت ہوگا جب یہ خود اپنی زباں سے کہہ دیں کہ ہمارے ساتھ چلیں گے۔"

"چلیں گے کیوں نہیں" حکیم مسیح کے سالے نے کہا "تم سامان تیار کراؤ۔ وہ اپنی مرضی سے نہ گئے تو ہم زبردستی لے جائیں گے۔"

یہ کہہ کر حکیم مسیح کے سالے نے اندر سفر کی تیاری کا دوبارہ حکم دیا اور حکیم مسیح کا ہاتھ پکڑ کر انھیں باہر لے گئے۔ یہاں انھیں قائل کرنے کے لئے بہت سے مسلمان ہمسائے موجود تھے، بزرگ جن کی حکیم مسیح بہت عزت کرتے تھے، ہم عمر دوست جن کی صحبت کے بغیر اُن کا زندہ رہنا دشوار ہوتا۔ یہ لوگ باری باری سے کبھی ایک ساتھ تقریریں کرتے رہے کبھی فرداً فرداً مگر حکیم مسیح نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ انھوں نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ ان کا خالدپور کے باشندوں کو اس طرح سے چھوڑ کر چلا جانا ایک شدید اخلاقی جرم ہے جس کا الزام نہ وہ اپنی بیوی پر لگا سکتے ہیں نہ رشتے داروں پر لیکن

انھوں نے اس وقت کی بھی تصویر کھینچی جب خالد پور میں ایک مسلمان بھی باقی نہ رہا ہوگا، ان کے سارے دوست اور عزیز ہندوستان کی وسعت میں غائب ہوگئے ہوں گے، وہ طرز زندگی جس سے وہ مانوس تھے ناممکن ہو جائے گا، وہ خود اگر زندہ رہے تو گھر میں اکیلے بیٹھے دوائیں بناتے رہیں گے اور اگر مر گئے تو اکیلے دفن ہوں گے اور ان کے جنازے کی نماز تک پڑھنے کے لئے کوئی مسلمان نہ ہوگا۔ خالد پور چھوڑنا ان کے لئے ایک اخلاقی جرم ضرور تھا مگر ایسی زندگی برداشت کرنا ایک شدید اخلاقی جرم کی سزا بھگتنے سے بھی انھیں زیادہ دشوار معلوم ہوا۔ انھوں نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ انھیں زندگی کے فرائض سے جلد سبک دوش کیا جائے اور سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

جب رات کو مسلمان قافلہ بستی سے نکلا تو حکیم مسیح اس کے ساتھ تھے۔

ان کو امید تھی کہ اپنے ضمیر کو وہ کسی طرح سے سمجھا بجھا کر منا لیں گے لیکن بد قسمتی سے ان کی کوئی تدبیر نہ چلی۔ انھوں نے ہزار کوشش کی کہ گذشتہ زندگی کو بالکل بھول جائیں مگر ان کا تخیل قابو سے نکل گیا اور ہر لمحہ ایک نیا صدمہ پہنچانے لگا۔ ذرا کہیں کھٹ کھٹ کی آواز آئی اور انھیں خیال آیا کہ اس وقت معلوم نہیں کتنے لوگ جن کو ابھی اس کی خبر نہیں ملی ہے کہ حکیم مسیح انھیں مصیبت میں چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں اُن کے دروازے کو کھڑے کھٹکھٹا رہے ہوں گے۔ کہیں کوئی بچہ رویا اور انھیں یاد آیا کہ ناگہانی موت کیسی بلا ہوتی ہے، خالد پور میں کتنے بچوں کی مائیں اس وقت ہاتھ مل مل کر کہہ رہی ہوں گی کہ اگر حکیم مسیح نہ چلے گئے ہوتے تو ان کے بچوں کی جان بچا لیتے۔ حکیم مسیح کی آنکھوں میں بار بار آنسو بھر آئے، سر چکر کھانے لگا، لیکن واپس جانے کی ہمت انھیں پھر بھی نہ ہوئی۔

قافلے نے خالد پور سے کوئی دس کوس پر جا کر منزل کی۔ حکیم مسیح تھک کر چور ہو گئے تھے، لیکن انھیں یقین تھا کہ نیند کسی طرح سے نصیب نہ ہوگی اور ہوا بھی یہی۔ کچھ دیر کے لئے تو ان پر ایک غفلت سی طاری ہو گئی جس سے ان کا تکان جاتا رہا، لیکن پھر وہ پریشان خواب دیکھنے لگے۔ کبھی وہ پہاڑ کی چوٹی پر سے پھسل کر نیچے گرتے تھے، کبھی گھوڑے پر سوار ایک غار میں پھاند پڑتے تھے جس کی تہ میں ایک خوفناک تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ خواب ہی میں انھیں خیال آیا کہ وہ دہلی جا رہے ہیں، ایک تیز آندھی آئی جس میں اُن کا گھوڑا کئی مرتبہ زمین پر سے اڑ گیا۔ اس کے بعد انھوں نے دیکھا کہ وہ ایک وسیع میدان میں کھڑے ہیں، ان کے سامنے ایک پتلی لمبی سی سڑک ہے جو دور جا کر کالے بادلوں کی گھٹا میں گم ہو جاتی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف ایک اونچی منڈیر ہے اور منڈیر کے بعد کھیتوں کا سلسلہ ہے جو کہیں ختم نہیں ہوتا۔ انھوں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور کالی گھٹا کی طرف روانہ ہوئے۔ دہلی کا رخ وہی تھا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد انھیں سامنے سڑک کے کنارے ایک سیاہ نقطہ سا نظر آیا۔ پاس پہنچے تو دیکھا کہ ایک آدمی غالباً ستانے کے لئے منڈیر پر بیٹھا ہے۔ انھوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور آگے بڑھ گئے، مگر کوئی دس قدم چلنے کے بعد ان کا گھوڑا رک گیا اور ایڑ اور چابک بھی اسے جگہ سے نہ ہلا سکے۔ واپس جانے پر وہ تیار تھا۔ آگے معلوم ہوتا تھا کہ اسے مردہ لے جانا بھی مشکل ہوگا۔ حکیم مسیح سمجھے کہ وہ کسی چیز کو دیکھ کر بھڑک گیا ہے اور اس کا مزاج درست کرنے کے لئے وہ تھوڑی دور واپس جانے پر راضی ہو گئے۔

مڑتے وقت ان کی نظر پھر اس مسافر پر پڑی۔ وہ منڈیر پر بیٹھا انھیں تک رہا تھا۔

گھوڑا کسی وجہ سے خود بخود اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور حکیم مسیح نے سوچا کہ کچھ دیر اسی سے باتیں کر لیں۔

گفتگو شروع کرنے سے پہلے حکیم مسیح نے اسے غور سے دیکھا۔ مسافر کا لباس ایک خوش حال کاریگر کا سا تھا یعنی ایک نیچی موٹے سوت کی دھوتی، اور اتنے ہی موٹے کپڑے کی بنڈی اور ایک پگڑی جو اس نے اس وقت اتار کر اپنے پاس زمین پر رکھ دی تھی۔ اس کے کندھوں اور پیٹھ پر ایک موٹی سخت اون کی کملی پڑی ہوئی تھی۔ مسافر کا قد بہت لمبا تھا، سینہ چوڑا، پٹھے تنے اور ابھرے ہوئے جس کی وجہ سے پہلی نظر میں وہ ایک معمولی انسان نہیں بلکہ ایک زندہ فولاد کی ڈھلی ہوئی مورت معلوم ہوتا تھا، اس کی ڈاڑھی کے لمبے سیدھے بال، اونچی پتلی ناک، چوڑی پیشانی، چہرے کا نمایاں سکون سب اسی وہم میں ڈالتے تھے کہ اس کا جسم آہنی ہے۔ مگر آنکھوں کو دیکھ کر یہ سارا طلسم ٹوٹ جاتا۔ اس کی بڑی بڑی نرگسی آنکھوں میں ایک نرمی اور محبت تھی جو اس کے جسم کی مضبوطی، اس کے قد و قامت پر حاوی تھی اور اُسے دیکھنے والا فوراً سمجھ جاتا تھا کہ وہ اس کا دوست اور ہمدرد ہے اور یہ مجسمۂ طاقت المجسمۂ محبت اور ایثار ہے۔ حکیم مسیح پر بھی ان آنکھوں کا اثر ہوا۔ وہ جواب میں مسکرا دیے اور دیر تک مسافر کے مردانہ حسن کا لطف اٹھاتے رہے۔ آخر کار انھوں نے پوچھا:۔

"اے آہنی جسم کے مسافر، تو کہاں جا رہا ہے؟"

مسافر نے پہلے سر جھکا لیا۔ پھر ان سے آنکھ لڑا کر کچھ مایوسی کے لہجے میں کہا "خالد پور۔"

"مگر وہاں تو ہیضہ ہے۔"

"ہاں، میں اسی لئے جا رہا ہوں۔"

حکیم مسیح کو اس قدر حیرت ہوئی کہ وہ تھوڑی دیر تک کچھ نہ کہہ سکے، لیکن مسافر نے انگڑائی سی لی اور انھیں اس خوب صورت مردانہ جسم پر رحم آیا جو جان بوجھ کر موت کو دعوت دے رہا تھا۔ انھوں نے بڑی حسرت سے مسافر کی طرف دیکھا اور پوچھا:۔

"اے مسافر! کیا تجھے اپنی جان عزیز نہیں؟"

مسافر نے ٹھہر ٹھہر کر کہا "مجھے اپنی جان بہت عزیز ہے اور ہمیشہ عزیز رہے گی۔ جتنی وہ مجھے عزیز ہے اتنی ہی وہ خدا کو زیادہ عزیز ہوگی، اگر میں نے اس کی راہ میں جان دی۔"

حکیم مسیح پھر چپ ہو گئے۔ مسافر کی صورت سے ظاہر تھا کہ اس کا قول پکا ہے۔ انھیں اپنی کمزوری یاد آئی اور اس بلند ہمت اور پختہ ارادے پر رشک آیا۔ لیکن انھوں نے سوچا کہ شاید یہ شخص دنیا میں اکیلا ہو اور انتہائی ایثار سے روکنے کے لئے کوئی دنیاوی تعلقات نہ ہوں۔ کچھ وہ اپنا بچاؤ بھی کرنا چاہتے تھے۔

"اے مسافر! کیا دنیا میں تجھ سے محبت کرنے والا نہیں؟"

"محبت کا جواب محبت ہے۔ میں جہاں جاتا ہوں مجھ سے محبت کرنے والے پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر محبت مجھے کبھی بھلائی سے نہیں روکتی۔"

آخری جملہ حکیم مسیح کے سینے میں تیر کی طرح لگا اور وہ بے تاب ہو گئے۔ انھوں نے گھبرا کر پوچھا:۔

"اے مسافر! تو کہاں سے آیا ہے؟"

"میں خدا کا بندہ ہوں۔ کسی ملک کا باشندہ نہیں" مسافر نے نہایت اطمینان سے جواب دیا "جس ملک میں میرا خدا مجھے پہنچا دے وہی میرا وطن ہے۔ اُسی کی خدمت میرا فرض ہے۔"

"لیکن تیرا مکان تو ضرور کہیں ہوگا؟"

"دنیا میں ہزاروں خدا کے بندے ہیں جن کے پاس مکان، بیوی، بچے کچھ نہیں...... میں جہاں تھکا وہیں بیٹھ جاتا ہوں، جہاں نیند لگی وہیں سو جاتا ہوں۔"

"مگر مسافر، تیرے بیوی بچے ہوتے تو تو کیا کرتا؟"

"عورت کی محبت سے بہتر اور کوئی نعمت خدا نے انسان کو نہیں بخشی ہے۔ میرے اگر بیوی ہوتی تو میں سب سے پہلے اس کے قدموں پر گرتا اور اس سے کہتا کہ مجھ میں طاقت نہیں، ہمت نہیں، صرف تیری محبت مجھے سیدھے راستے پر چلا سکتی ہے۔ چل میری رہبری کر۔ میں تیرے بغیر بالکل مجبور ہوں۔"

"مگر مسافر، ہیضے کا علاج محبت سے کیوں کر ہو سکتا ہے؟" حکیم مسیح نے مسافر کو ٹوک کر کہا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے پر تیار تھے۔ بدن پسینے سے شل ہو گیا تھا۔

"محبت ہر بیماری کا علاج ہے، ہر زخم کا مرہم ہے، محبت زندگی اور موت کا فرق مٹا دیتی ہے، ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔ انسان کی محبت میں خدا کی رحمت کی تاثیر ہے۔ تجھے یقین نہ آئے تو تجربہ کر کے دیکھ لے۔"

حکیم مسیح نے سر جھکا لیا اور زار و قطار رونے لگے۔

"حکیم مسیح" مسافر اچانک بول اٹھا "مسلمان کوئی کسی خاص ملک میں پیدا

ہونے سے نہیں بنتا، اسلام کسی خاص طرزِ معاشرت کا نام نہیں، مسلمان بننا چاہتے ہو تو جاؤ خدا کو سجدہ کرو، دنیا کی مصیبتیں جھیلو، دوسروں کی خدمت کرو، ان پر سے زندگی کا بوجھ ہلکا کرو، تمہارے دل میں ایمان کا خزانہ ہے۔"

حکیم مسیح کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اس قدر روئے تھے کہ تکیے بھیگ گئے تھے لیکن ان کو اب نہ اپنی سرخ آنکھوں کی پروا تھی نہ تھکے ماندے جسم کی۔ انھوں نے "یا رسولؐ" کا نعرہ مارا، پلنگ پر سے اچک کر دوڑتے ہوئے اصطبل گئے اور ایک گھوڑے پر بغیر زین کے سوار ہو کر خالد پور کی طرف چل دیے۔

رات کو حکیم مسیح کے جانے کی خبر سن کر خالد پور کی آبادی میں اودھم مچ گئی۔ کسی میں اتنی ہمت باقی نہیں رہ گئی تھی کہ ہیضے سے بچنے کی امید کرے اور ہر شخص اپنا ماتم کرنے لگا۔ لیکن سویرے جب حکیم مسیح کی واپسی کی خبر مشہور ہوئی تو ہر ایک کی جان میں جان آگئی۔ جس نے بھی یہ خبر سنی اپنا دل مضبوط کرنے کے لیے ان کے مطب میں بھاگا ہوا گیا اور اس نے حکیم مسیح کو دواخانے کے دروازے پر بیٹھا ہوا پایا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے، شرمندگی سے ان کی نظریں نیچی تھیں، مگر جس کسی نے چاہا نبض دکھائی اور دوا لی۔

اُدھر سویرے جب مسلمان قافلے نے کوچ کی تیاری کی تو معلوم ہوا کہ حکیم مسیح غائب ہیں۔ نوکروں میں سے ایک نے کہا کہ اس نے رات کے تیسرے پہر "یا رسولؐ" کا ایک نعرہ سنا تھا لیکن اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہ بتا سکا۔ حکیم مسیح کی بیوی کو جب یہ معلوم ہوا تو فوراً سمجھ گئیں کہ وہ خالد پور بھاگ گئے ہیں۔ وہ بہت روئیں، اپنے دونوں بچوں کو بھائی کے سپرد کیا اور بیوہ کی زندگی سے بچنے کے لیے شوہر کے ساتھ

مرنے کے لئے خالد پور چلیں۔

جب وہ اپنے گھر پہنچیں تو شام ہو چکی تھی۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ حکیم صاحب سویرے سے دواخانے کے سامنے بیٹھے ہیں، نہ پانی پیا ہے، نہ کھانا کھایا ہے، بال پریشان ہیں، آنکھیں سرخ، لیکن مریضوں کا تانتا بندھا ہے اور وہ برابر نبض دیکھ رہے ہیں اور دوائیں دے رہے ہیں۔ انھوں نے نوکر کے ذریعے خبر بھیجنا چاہا مگر نوکر کو حکیم صاحب کے پاس پہنچنے میں دیر لگی اور جب وہ پہنچ بھی گیا تو حکیم صاحب نے نہ اسے پہچانا نہ اس کی بات سمجھے۔ رات بھر انھوں نے حکیم صاحب کا نہایت بے تابی سے انتظار کیا لیکن جب وہ سویرے تک نہیں آئے تو خود مطب پہنچیں۔ وہاں ابھی سے لوگ موجود تھے لیکن انھیں دیکھ کر راستہ چھوڑ دیا اور وہ حکیم صاحب کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئیں۔ حکیم مسیح انھیں آسانی سے پہچان نہ سکے لیکن جب پہچان لیا تو مسکرائے، کچھ سوچا اور کہا:۔

"......... محلے میں کچھ عورتیں بیمار پڑی ہیں۔ میں نے دوا بھیج دی ہے، لیکن ان کی تیمارداری کے لئے کوئی نہیں۔ آپ وہاں چلی جائیں......"

حکیم مسیح کی بیوی نے ان پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ پچھلے دنوں کی تکان کا نام ونشان نہ تھا۔ آنکھیں اب بھی سرخ تھیں مگر چہرے سے نور برس رہا تھا۔ کپڑوں پر کچھ مٹی لگی رہ گئی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ رات کو زمین پر سوئے ہیں۔ یہ ایک نظر کافی تھی۔ وہ باہر نکلیں اور راستہ پوچھتے پوچھتے جس محلے کا حکیم مسیح نے نام بتایا تھا وہاں پہنچ گئیں۔

خالد پور میں دو مہینے ہیضے کا دورہ رہا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بیماروں کا

علاج کیا جاتا تھا لیکن بیماری کو روکنے کی کوئی تدبیر نہ تھی۔ لیکن اگر حکیم مسیح نہ ہوتے تو غالباً ساری بستی تباہ ہو جاتی۔ ان کی موجودگی سے وہم اور خوف، جو اکثر بیماری سے زیادہ مہلک ثابت ہوتے ہیں، لوگوں کے دلوں میں جڑ نہ پکڑ سکے۔ کوئی مریض ایسا نہیں تھا جسے وہ دیکھ نہ سکے ہوں یا جس کی ہمت ان کے اخلاق اور ہمدردی نے دوگونہ نہ کی ہو۔ وہ دن رات مریضوں کو دیکھتے ہیں اور ان کے لئے دوائیں تیار کرنے میں مشغول رہتے تھے، لیکن یہ بھی ان کو اطمینان دلانے کے لئے کافی نہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ مردوں کو نہلانے دھلانے اور جنازے کو شہر سے باہر پہنچانے میں مدد دیں۔ مگر اس کام کے لئے ان کی کبھی ضرورت نہیں ہوئی۔ یہ ان کی بیوی نے اپنے ذمے لے لیا تھا، جس کو وہ علاوہ عورتوں کی تیمارداری اور یتیم بچوں کی دیکھ بھال کے کرتی تھیں۔ اپنی اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے اس زمانے میں حکیم مسیح اور ان کی بیوی اکثر ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہ سکے۔ مگر بستی والوں کو ان دونوں سے اس قدر محبت ہو گئی تھی کہ غیروں کے ذریعے سے انھیں ایک دوسرے کی خبر پہنچتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا ہوا کہ بیماری اور موت کی پریشانیوں میں دوسرے بھی انھیں بھول گئے اور ان کے ضمیر نے ملاقات کے لئے فرائض ترک کرنے کی اجازت نہ دی۔ مگر ان کے دلوں میں اس قدر قوی اور زندہ ایمان تھا کہ مایوسی، خود غرضی یا خوف ان کے پاس نہ پھٹکنے پائے اور وقت اور فاصلہ ان کی روحوں کو جدا نہ کر سکے۔

آخر کار ہیضے کا زور کم ہوا اور اب وہ حالت ممکن ہونے لگی جسے حکیم مسیح موت کی سزا سے زیادہ تکلیف دہ سمجھتے تھے۔ مریض کم ہوئے، کام کم ہوا، فرصت کا وقت بڑھا، مگر اب حکیم مسیح ہندو آبادی میں گھل مل گئے تھے جو دیوار وہم نے ان کے اور ہندوؤں کے

درمیان میں کھڑی کر دی تھی نیست و نابود ہو چکی تھی۔ بغیر کسی کوشش کے حکیم مسیح کا مکان بستی کی زندگی کا مرکز بن گیا تھا، ایک درگاہ جہاں حاجت مند مدد کے لیے آتے تھے، ماہران فن قدر دانی اور ہمت افزائی کے لئے، مظلوم شکایت کے لئے اور جھگڑالو انصاف کے لئے۔ ان کی شہرت کا ڈھنڈورا دور دور تک پٹ چکا تھا، لوگ دور دور سے ان کے پاس آتے تھے اور دل میں اس کا افسوس واپس لے جاتے تھے کہ حکیم صاحب کافی مشہور نہیں۔ جس نے حکیم مسیح کا نام سنا وہ ان کی بیوی کی شخصیت سے بھی ضرور واقف ہو جاتا تھا۔

خالد پور میں کوئی ایسا ذاتی یا عام معاملہ نہ تھا جس کا حکیم مسیح یا ان کی بیوی کو علم نہ ہو اور نہ کوئی ایسی تقریب تھی جس میں ان کی شرکت لازمی نہ سمجھی جاتی ہو لیکن باوجود اس کے ان کی زندگی کا ایک پہلو تھا جس کا راز سوائے ان کے اور ان کے خدا کے کسی پر ظاہر نہ تھا۔ لوگ انھیں مصروف دیکھتے تھے، انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ان دونوں کے دل کہیں اور ہیں اور وہ محبت اور پیار کی نظریں جو وہ اوروں پر برساتے ہیں اسی محبت کا ایک دھندلا عکس ہے جس میں ان کی ہستیاں فنا ہو گئی ہیں۔ وہ دونوں بھی جانتے تھے کہ یہ محبت کوئی پرانی چیز نہیں ہے، خود بخود نہیں پیدا ہوئی اور ہر حالت میں قائم نہیں رہ سکتی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہی ان کی انسانیت کا جوہر ہے اور اگر وہ اس کی قیمت کم نہیں کرنا چاہتے تو انھیں وہ آگ جلاتے رہنا چاہیے جس میں وہ پختہ ہوئی تھی۔ اس لئے جب حکیم مسیح نے دیکھا کہ ہفتہ انھیں بہت زیادہ مصروف نہیں رکھتا تو انھوں نے خالد پور کے باشندوں سے ایک مسجد بنانے کی اجازت مانگی۔ وہ اس پر بہت خوشی سے راضی ہو گئے بلکہ مسجد اپنے خرچ سے بنوانے کی خواہش ظاہر کی لیکن حکیم مسیح کو یہ منظور نہ ہوا۔ انھوں

نے اپنی بیوی کی مدد سے تھوڑے دنوں میں ایک چھوٹی سی کچی مسجد ایک بڑے سایے دار درخت کے نیچے تیار کرلی جس میں صرف یہ خوبی تھی کہ اُسے دو سچے حق پرستوں نے اپنے دین اور اپنی محبت کو پختہ رکھنے کے لیے بنایا تھا۔

ہر شام کو مغرب کے وقت حکیم مسیح اپنی بیوی کو ساتھ لے کر اس مسجد میں جایا کرتے تھے اور وہاں کبھی ایک گھنٹہ، کبھی دو گھنٹے اور کبھی ساری رات گذارتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کی بیوی کو آنے سے ذرا دیر ہوگئی، وہ مغرب کی نماز پڑھ چکے تھے، ان کی بیوی پڑھ رہی تھیں۔ حکیم مسیح ان کی طرف منہ کرکے بیٹھ گئے۔ ان کی بیوی نہایت خلوص سے نماز پڑھ رہی تھیں اور اس سے ان کے چہرے پر ایسی رونق آگئی تھی کہ حکیم مسیح اپنی نظر نہ ہٹا سکے۔ دیکھتے دیکھتے انھیں یاد آیا کہ انھوں نے اپنی بیوی سے نہ اپنے خواب کا ذکر کیا ہے نہ اس آہنی جسم والے مسافر کا جس نے ان کو خالد پور واپس بھیجا۔ وہ خود اس خواب کے اثر سے ایثار کی مصیبتیں جھیل سکتے تھے۔ اس بے چاری عورت کو یہ روحانی تقویت بھی نہیں میسر ہوئی، مگر اس پر بھی وہ ان سے ایک قدم پیچھے نہیں رہی۔ آہنی جسم والے مسافر کی طرح حکیم مسیح بھی دل ہی دل میں اپنی بیوی کے قدموں پر گرے اور اس سے التجا کی کہ اپنی محبت سے ان کی ہمت دوگونہ کرے، ان کے فرائض یاد دلاتی رہے اور انھیں ادا کرنے کی طاقت بخشے۔

جب ان کی بیوی نے سلام پھیرا تو انھوں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہیں اور وہ ٹکٹکی لگائے ان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے وجہ پوچھی۔ حکیم مسیح کچھ دیر تک جواب نہ دے سکے۔ پھر اپنے خواب کا سارا قصہ سنایا اور آخر میں کہا:۔

"تم کو شاید یاد ہو میں نے ایک مرتبہ اسی وقت شام کو ایک ایسے کیمیاگر کی آرزو کی تھی جو اس ملک کو میرا وطن بنادے، اس قوم میں مجھے کھپادے۔ دیکھو اس کیمیاگر نے ہم دونوں کو کیا سے کیا بنادیا۔"

باتیں کرتے کرتے حکیم مسیح اپنی بیوی کے بالکل پاس پہنچ گئے تھے۔ ان کی بیوی نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر چوما، ان کے منہ پر ایک دعا پڑھ کر پھونکی اور پھر دونوں اپنے کیمیاگر کے تصور میں محو ہوگئے۔

خاں صاحب

ہمارے محلے میں ایک خاں صاحب رہتے تھے۔ میں نے جب انھیں پہلی مرتبہ دیکھا تو ان کی عمر قریب پینتالیس سال کے تھی، مگر روایات سے معلوم ہوا کہ ان کے بال ہمیشہ سے ایسے ہی سیاہ وسپید کی آمیزش رہے ہیں، آنکھیں ایسی ہی خونی، مزاج ترش اور ٹوپی میلی۔ بواسیر کی شکایت بھی ان کی ہستی سے وابستہ تھی۔ مدتوں سے وہ شہر کے تمام طبیبوں اور ہندوستان کی تمام درگاہوں کی برائی کرتے چلے آرہے تھے۔

ہمارے محلے میں کسی کو بھی وہ دن یاد نہ تھے جب خاں صاحب کی کریہہ اور دل لرزانے والی آواز گلی کوچے میں نہیں گونجتی تھی، یا ان کا سیاہ چہرہ، قوی ہیکل جسم اور لمبا لٹھ خوف اور نفرت سے لوگوں کی نگاہیں نیچی نہیں کر دیتا تھا۔ خاں صاحب کے پیشے کا کسی کو علم نہ تھا، سوا ان کم بختوں کے جنھیں کسی ناگہانی مصیبت میں روپیے کی ضرورت ہوئی اور انھوں نے خاں صاحب سے مدد مانگی۔ مگر ان کی کیا مجال تھی کہ گالیاں سن کر اور سود در سود ادا کر کے بھی خاں صاحب کے پیشے کا کسی سے ذکر کریں۔

خاں صاحب سویرے جا کر مؤذن کو جگاتے تھے، مسجد کا امام ان کے ڈر سے نماز میں لمبی سورتیں پڑھتا تھا، دیر تک دعا مانگتا اور دعا مانگتے مانگتے کثرت گناہ کا احساس اسے اکثر رلا بھی دیتا تھا۔ خاں صاحب کی ذات نے اس مسجد کو جو علاوہ جمعے کے ویران پڑی رہتی تھی اجتماع مسلمین کا مرکز بنا دیا تھا، جہاں پنج وقتہ نماز باجماعت ہوا

کرتی تھی۔ خاں صاحب کی ڈاڑھی دیکھ کر شریفوں کیا غنڈوں میں بھی ڈاڑھی مونڈنے کی ہمت نہ رہی۔ خاں صاحب کا چہرہ سیاہ اور آنکھیں خونی تھیں تو کیا، انھوں نے سینکڑوں مسلمانوں کی صورتیں منور کر دی تھیں۔ ان کا مزاج ترش تھا تو کون سی شکایت کی بات، جب ان کی وجہ سے اتنے گمراہ بندے اپنے خدا کے قہر سے پناہ مانگنے لگے تھے۔

ہمارے محلے کے بنیے تو مستقل اختلاج کے مریض ہو گئے، مگر بنیوں کا کیا، ان کا تو پیشہ یہی ہے، اگر دھوتی میل سے کالی اور قلب میں اختلاج نہ ہو تو وہ سود کا نرخ کیسے بڑھائیں۔ خاں صاحب شریعت کے ایسے عالم تھے کہ بغیر کفر کا الزام اپنے سر لیے دنیاوی معاملات میں بھی کوئی ان کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا، منطقی ایسے کہ جوش گفتار سے دوسرے کا دماغ پھرا دیں اور فلسفی اس پایے کے کہ جب بیان شروع کریں تو کسی سے بغیر ہاں میں ہاں ملائے نہ بن پڑے۔ خاں صاحب نہایت فصاحت و بلاغت سے دین اسلام کی خوبیاں اپنے پست اندیشہ ہم جنسوں پر روشن کرتے، تنگ نظروں کو خدا کی مصلحت سمجھاتے اور مناظر کائنات کی تعریف میں سرد آہیں بھرتے تھے۔ ہمارا محلہ غریبوں کا تھا، کسی بے چارے کو اتنی مہلت کہاں ملتی تھی کہ شریعت، فلسفہ، منطق اور جمالیات میں یہ امتیاز حاصل کرے۔ خاں صاحب نے اپنی عقل و دانش اور مہیب شخصیت کے اثر سے محلے والوں کے دل و دماغ اور قوتِ ارادے کو معطل کر دیا تھا اور محلے والے غلامی کے ایسے عادی ہو گئے تھے کہ انھیں اپنی آزادی کے دن تک یاد نہ رہے۔

خاں صاحب جب ہمارے محلے میں آ کر بسے تو اپنی بیوی کو ساتھ لائے تھے۔ مدتوں تک نہ کسی نے ان کی بیوی کی صورت دیکھی، نہ کسی کو ان کے گھر کا حال معلوم

ہوا۔ بہت دن ہوئے ایک بچہ ان کے دروازے کے سامنے کھیلتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ سال دو سال بعد ایک بچی بھی اس کے ساتھ کھیل میں شریک ہونے لگی، مگر لوگ خاں صاحب کے مکان کی طرف سے بغیر ضرورت کے گذرنا پسند نہیں کرتے تھے، اور جب بچہ کسی بیماری میں مرگیا تو لوگ بھول گئے کہ خاں صاحب کے ایک لڑکی بھی ہے۔ میری خالہ کو یہ معلوم تھا اس لئے کہ وہ بچے کی تعزیت میں ہمت کر کے خاں صاحب کے یہاں جا پہنچی تھیں۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد وہ مہینے بھر تک بخار میں مبتلا رہیں۔ مزاج پرسی کے سلسلے میں خاں صاحب کی بیوی کا بھی میری خالہ کے یہاں کئی دفعہ آنا ہوا اور یوں دونوں بی بیوں کے تعلقات بڑھ گئے، مگر خاں صاحب کی بیوی کی کیا مجال تھی کہ انسانیت کے فرائض ادا کریں اور میری خالہ کے گھر میں قدم رکھیں، اگر میری خالہ کو ان کی سخاوت، دین داری اور غریب پروری نے محلے کیا تمام شہر میں مشہور نہ کر دیا ہوتا۔ بیوہ ہونے کے بعد انھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے سامنے مرتے دیکھا تھا۔ اس صدمے نے دنیا سے ان کی طبیعت ایسی ہٹا دی کہ انھوں نے اپنی عمر عبادت کے لئے وقف کر دی اور جائداد کی ساری آمدنی غریب بچوں کی تربیت اور حاجت مندوں کی امداد میں صرف کرتی تھیں۔ ہر مولوی، ملا، امام، حافظ، عالم کو ان کے یہاں سے وظیفہ ملتا تھا۔ جن لوگوں کو خاں صاحب سود پر روپیہ دیتے تھے وہ ان کے یہاں اکثر آ چکے تھے اور خاں صاحب کے ہتھے اس وجہ سے چڑھے کہ مستقل وظیفوں میں میری خالہ کی آمدنی صرف ہو جاتی تھی اور وہ خود کبھی کبھی فاقے سے رہتی تھیں۔ خاں صاحب نے شریعت کی پابندی اور ٹکے کے زور سے جو اقتدار حاصل کیا تھا وہ میری خالہ کے اثر سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسی وجہ

ے جب کبھی ان کی بیوی میری خالہ سے ملنے آئیں تو وہ اپنا سلام بھی کہلا بھیجتے۔ میری خالہ کو یہ معلوم ہوگیا کہ خاں صاحب کو ڈولی کا کرایہ دینا ناگوار گذرتا ہے اور انھوں نے خاں صاحب کی بیوی کو پیشگی کرایہ بھیجنے کا قاعدہ بنا لیا۔ اس پر بھی خادمہ کو سخت تاکید تھی کہ خاں صاحب اسے دیکھ نہ پائیں ورنہ وہ کرایہ وصول کر لیتے اور کہلا بھیجتے کہ بیوی کی طبیعت بہت خراب ہے۔

خاں صاحب کی بیوی کو جب میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تو وہ ادھیڑ عمر کی تھیں، مگر اس سن پر بھی ان میں جوانی کے حسن کی جھلک نظر آتی تھی، جسے دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ وہ خاں صاحب کے پنجے میں کیسے پھنسیں، اونچا قد، سڈول جسم، بڑی بڑی پراسرار آنکھیں، لہجے میں متانت۔ ہر شخص امیر ہو یا غریب، جوان ہو یا بوڑھا انھیں دیکھتے ہی اپنے دل میں ان کی عزت کرنے لگتا۔ برتاؤ میں ایسی ہمدردی، ایسا خلوص کہ دل سے ہزار پریشانیوں کی کدورت دور کر دے۔ طبیعت کی شریف ہونے کے علاوہ وہ اتنی تعلیم یافتہ اور مہذب تھیں کہ میری خالہ کو یقین ہوگیا کہ خاں صاحب کے ساتھ ان کی شادی سوچ سمجھ کر نہیں کی گئی۔ غالباً ان کے ماں باپ پر کوئی ایسی ہی مصیبت آئی ہوگی کہ ان بیچاروں کو ایسی لڑکی ایسے آدمی کے سپرد کر دینا بھی غنیمت معلوم ہوا۔ اصل واقعہ میری خالہ باوجود کثرت ملاقات کے دریافت نہ کر سکیں۔ ایک دو بار انھوں نے پوچھا تو ضرور لیکن خاں صاحب کی بیوی نے سرد آہیں بھر کر ٹال دیا اور ان کا تکلف دیکھ کر میری خالہ نے پوچھنا چھوڑ دیا۔ اس ناواقفیت سے ان دونوں کی گہری دوستی اور محبت میں کوئی فرق نہیں آیا اور جب خاں صاحب کی بیوی نے ایک دن میری خالہ سے درخواست کی کہ ان کی بچی کی پرورش وہ اپنے ذمے لے لیں تو ان کی محبت اور پختہ ہوگئی۔

خاں صاحب کی بچی سکینہ اس زمانے میں دس بارہ برس کی تھی۔ میری خالہ کی بہت پہلے سے خواہش تھی کہ اسے اپنے ساتھ رکھیں لیکن ایک ستم زدہ ماں سے اس کی اکلوتی بچی کا مانگنا انھیں کسی صورت سے گوارا نہ ہوا۔ خاں صاحب کی بیوی نے شریفوں کے یہاں تربیت پائی تھی اور گو انھیں یقین تھا کہ میری خالہ کو ان کی بچی سے بہت محبت ہے مگر انھوں نے اپنی طرف سے کبھی کوئی اشارہ نہیں کیا۔ سکینہ جب میری خالہ کے یہاں آتی تو بہت خوش ہوتی، کھیلتی کودتی، خالہ کی خدمت بھی کرتی، جب جاتی تو ہمیشہ آنکھوں میں آنسو لے کر جاتی اور خالہ سے وعدہ لے کر کہ وہ اسے پھر جلد یاد کریں گی۔ مگر دونوں بی بیوں کے تکلف میں پانچ چھ سال گذر گئے۔ خالہ کے یہاں وہ مستقل طور پر یوں آگئی کہ وہ بڑی ہوگئی تھی، کہاروں نے اسے ماں کے ساتھ نہیں بیٹھنے دیا اور خاں صاحب نے اعلان کیا کہ اگر انھوں نے کبھی اسے رستے میں چلتے دیکھا تو اس کا گلا گھونٹ دیں گے۔ خالہ پر کہاروں کا کرایہ ویسے بھی چڑھ گیا تھا، ایک اور ڈولی کی درخواست ان سے کیسے کی جاتی۔ پھر بھی یہ انتظام زیادہ تر سکینہ کی تحریک سے ہوا۔ وہ ابھی تک اپنی ماں کی مجبوریاں اور باپ کی فطرت کو نہیں سمجھی تھی۔ اس نے ایک دن کہا کہ وہ خالہ کے ساتھ رہنا چاہتی ہے اور ماں نے خود ہمت کر کے اپنی طرف سے یہ درخواست کردی، اس خوف سے کہ وہ کہیں واقعی کہہ نہ دے اور میری خالہ کو گمان ہو کہ وہ براہ راست نہیں کہنا چاہتی تھیں اس لئے لڑکی سے کہلوایا۔ جب سکینہ کا میری خالہ کے ساتھ رہنا طے ہوگیا تو انھیں اور بھی مصلحتیں سوجھیں خاں صاحب سکینہ کو میلے جھنڑوں میں رکھتے تھے۔ اب وہ ایسی بچی نہیں رہی تھی کہ میلی ہونے کا الزام اسی پر لگا دیا جائے، مگر وہ خاں صاحب کو اپنی گرہ سے کچھ خرچ کرنے پر آمادہ نہ کرسکیں۔ خاں صاحب سے یہ امید کرنا بھی فضول تھا کہ وہ اس کی آئندہ زندگی کے

لیے سامان کریں گے۔ میری خالہ کے جو تعلقات تھے انھیں دیکھتے ہوئے سکینہ کے لئے ایک ہونہار شریف زادے کی تلاش کرنا کوئی مشکل بات نہ تھی۔

یہ سب تدبیریں تھیں۔ پھر یکایک تقدیر نے اپنی صورت دکھائی جب سکینہ میری خالہ کے پاس ایک مہینے کے قریب رہ چکی تھی تو خاں صاحب نے اپنی بیوی سے پوچھا:۔

"کیوں ری سکینہ کی تنخواہ تو نے کاہے میں خرچ کر ڈالی؟"

خاں صاحب کی بیوی سہم گئیں۔

"کیسی تنخواہ؟"

"ہونہہ! کیا کوئی اپنی پلی پلائی لڑکی کسی کو مفت دیتا ہے؟"

خاں صاحب کی بیوی نے بجائے جواب دینے کے اپنا منہ چادر میں لپیٹ لیا اور روتے روتے سو گئیں۔ اپنے شوہر کی بے حیائی پر انھیں ہر دوسرے تیسرے روز شرمندہ ہونا پڑتا تھا۔ اس کی وہ عادی ہو گئی تھیں لیکن اب تو انھیں خود بھی ذلیل کرنے کی ترکیبیں تھیں۔ اگر بچنے کی کوئی امید ہوئی تو وہ اس کی فکر کرتیں لیکن انھیں یقین تھا کہ خاں صاحب بغیر اپنے ٹکے وصول کئے نہ مانیں گے۔ وہ اسی کشمکش میں تھیں کہ بات کیسے بنائی جائے۔ ایک روز جب وہ میری خالہ کی ڈیوڑھی میں ڈولی پر سے اُتریں تو خاں صاحب نکلتے ہوئے دکھائی دیے، اندر پہنچیں تو خالہ کو برہم پایا اور وہ بے چاری اپنا سا منہ لے کر ایک کونے میں بیٹھ گئیں، خالہ کو سلام کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

جب مغرب کے بعد سکینہ کے ذریعے سے معلوم ہوا کہ خالہ کا غصہ اتر گیا ہے تو روتی ہوئی ان کے سامنے آئیں۔ خالہ نے انھیں گلے لگا لیا، ہمدردی کے کچھ آنسو ٹپکائے مگر بہت دیر خاموش بیٹھی رہیں کہتیں تو کیا کہتیں؟ خاں صاحب نے اپنے افلاس کا

دکھڑا رو دیا تھا۔ نہایت عجز و انکسار کے ساتھ نوٹس دے گئے تھے کہ "میری لڑکی مجھے واپس مل جائے یا میری بھی پرورش ہو۔ ماں بوڑھی ہے اس سے کچھ کام کاج ہوتا ہواتا نہیں۔ اسے خود سہارے کی ضرورت ہے۔ میں جو کچھ کرسکتا ہوں کرتا ہوں لیکن میں روٹی تو نہیں پکا سکتا! اتنی میری حیثیت نہیں کہ کسی کو نوکر رکھوں۔ اب حضور خود ہی سمجھ لیں۔ آدمی اولاد کی پرورش اسی لئے کرتا ہے کہ بڑھاپے میں آرام ملے!" میری خالہ سمجھ گئیں۔ اگر ہو سکتا تو وہ کچھ نقدی خاں صاحب کے حوالے کرتیں مگر انھیں خود ان دنوں روپیے کی بہت سخت ضرورت تھی۔ زیادہ غصہ انھیں اپنی بے بسی پر آیا مگر جس طرح سے خاں صاحب نے اپنی بیوی کے ضعف پیری اور ان کی حاجتوں کو گفتگو میں پیش پیش رکھا، وہ بھی انھیں بہت ناگوار گذرا۔ خاں صاحب کی بیوی نہ بوڑھی تھیں نہ ضعیف۔ گھر کا کام کاج کر کے وہ اکثر میری خالہ کے یہاں پکانے میں مدد کرتی تھیں۔ خاں صاحب جس کفایت شعاری سے رہتے تھے اس کے لحاظ سے امور خانہ داری کوئی بار نہیں ہو سکتے تھے، نہ کسی کا قرض، نہ کہیں سے تقاضا، نہ کوئی بحث مباحثہ۔ اور پیٹ بھی کتنے بھرنے تھے۔ جب سے سکینہ چلی گئی تو چار روٹی، ذرا سی بھاجی ہفتے عشرے میں دو چار بوٹی گوشت۔ اور جب وہ تھی تو بھی ماں اپنے حصے میں سے اسے کھلاتی تھی۔ خاں صاحب کو کبھی یہ محسوس تک نہ ہوا کہ وہ اولاد کی پرورش کر رہے ہیں۔

یہ سب ماجرا خاں صاحب کی بیوی نے میری خالہ کو سنایا مگر اس متانت اور ضبط سے کہ خاں صاحب پر کسی طرح کا صریحی الزام نہ آئے۔

"یہ تو سب کچھ ہے مگر بی بی میں شکایت کس منہ سے کروں۔ خاں صاحب ایسے متقی، پرہیزگار، روزہ نماز کے پابند ہیں کہ جس کسی سے بھی پوچھو وہ بتا دے گا کہ

ان کی ذات سے کتنوں کو فائدہ پہنچا، کتنے مسلمان اپنے فرائض سے آگاہ ہوئے مسجد ویران پڑی رہتی تھی اب وہاں پنج وقتہ نماز باجماعت ہوتی ہے۔ ہزاروں کے لبوں پر اللہ کا نام ہے۔ سینکڑوں ان کی دلیلوں سے قائل ہو کر شریعت کے احکام پورے کرنے لگے ہیں۔"

"ہاں بہن، اس میں تو کوئی کلام نہیں۔"

"اور پھر بی بی وہ معاملے کے ایسے صاف سچے ہیں۔ جھوٹے وعدے سے زیادہ انھیں کوئی بات ناگوار نہیں ہوتی۔ مجھ سے خود ہی کہہ رہے تھے کہ سکینہ کو اس طرح آپ کے منتھے تھوپ دینا بے جا ہے۔"

"تم بھی بہن کیسی باتیں کرتی ہو...... سکینہ کو تو میں اپنی بیٹی سمجھتی ہوں۔"

"یہ تو بی بی میں جانتی ہوں، میرا دل جانتا ہے...... مگر ہم لوگ غریب ہیں۔ آپ کو چاہے جتنی محبت ہو خاں صاحب کو تو ہمیشہ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں اس کا دماغ نہ پھر جائے...... اسے آخر غریبوں ہی کے گھر زندگی بسر کرنا ہے۔"

"واہ بہن، تم نے بیٹھے بیٹھے مجھے رئیس خوب بنا دیا۔ میں بھلا اس کی کون سی خاطر کر سکتی ہوں کہ اس کا دماغ پھر جائے۔ تم خود ہی روز دیکھتی ہو کہ میں کیسے رہتی ہوں اور وہ کیسے رہتی ہے۔"

"بی بی آپ کو تو سخاوت اور دین داری نے غریب کر دیا ہے۔ ہماری نظروں میں تو آپ رئیس ہی ہیں۔"

"اچھا بہن، اگر ایسا ہی ہے تو اپنی لڑکی لے جاؤ۔ میں کوئی اور سہارا ڈھونڈھ لوں گی۔ تمہاری بیٹی کی عادتیں تو نہ بگڑنے پائیں۔" میری خالہ نے ٹھنڈی سانس لی،

اور منہ پھیر لیا۔

خاں صاحب کی بیوی چونکنّی ہو گئیں۔ وہ خاں صاحب کی صفائی تو ضرور کرنا چاہتی تھیں لیکن سکینہ کو اپنے گھر واپس بلا لینا بھی انھیں کسی صورت سے منظور نہ تھا۔

"بی بی، آپ خفا نہ ہوں۔ خاں صاحب تو بات کے دھنی ہیں۔ جو بات جی میں ٹھان لیتے ہیں اسے چاہتے ہیں کہ فوراً کر بھی دکھائیں۔ میں نے انھیں سمجھایا تھا کہ ابھی آپ کے پاس حاضر نہ ہوں، مجھے پہلے آپ کو سارا ماجرا سنا لینے دیں۔ سکینہ آپ کی لونڈی ہے، بھلا ہمیں کب یہ گوارا ہو گا کہ اس کی وجہ سے آپ کو کسی طرح کی تکلیف پہنچے۔ اس کی پرورش منظور ہے تو بڑی خوشی سے اپنے پاس رکھیے۔ وہ بھی سدھر جائے گی، ہم بھی آپ کو دعا دیں گے۔ آپ جیسا سرپرست اس دنیا میں اسے کہاں ملے گا......"

"مگر بہن" خالہ نے بات کاٹ کر کہا "میں اسے تنخواہ تو نہیں دے سکتی۔ میرے پاس جو کچھ ہے اس کا حساب کتاب تم خود جانتی ہو۔"

"بی بی خدا کا شکر ہے اس نے ہم کو کھانے کو دیا ہے۔ خاں صاحب کا تو یہ منشا بھی نہ تھا کہ اس کے نام سے ہماری پرورش کریں۔ ہاں وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ سکینہ اپنی حیثیت نہ بھول جائے۔ وہ آپ کی لونڈی ہے، کبھی اپنے آپ کو بیٹی نہ سمجھنے لگے۔ یہی انھیں اندیشہ تھا مگر وہ بات کرنا نہیں جانتے۔ خدا جانے آپ سے کیا کہہ بیٹھے۔ آپ ناراض نہ ہوں میں انھیں سمجھا لوں گی۔"

"ہاں بہن تم انھیں سمجھا دو۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ حاضر ہے۔ تنخواہ دینا میرے بس کی بات نہیں۔"

خاں صاحب کی بیوی کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے گھر چلی گئیں۔ وہاں پہنچ کر میاں بیوی میں کچھ جھگڑا ہوا مگر رو پیٹ کر بھی خاں صاحب کو ان کی بیوی اس پر آمادہ نہ کر سکیں کہ وہ تنخواہ سے دست بردار ہوں۔ خالہ سے جو گفتگو ہوئی تھی اُسے سن کر انھیں ایک اور قوی دلیل مل گئی۔

"ہم غریب آدمی ہیں" انھوں نے اپنی بیوی سے کہا "اگر سکینہ کے سامنے ہر مہینے اس کی تنخواہ وصول نہ کی گئی تو وہ خود کو رئیس زادی سمجھنے لگے گی۔ ہماری صورتیں دیکھ کر ناک بھوں چڑھانے لگے گی۔"

"ارے واہ!" خاں صاحب کی بیوی نے بگڑ کر کہا "تم میری لڑکی کو سمجھے کیا ہو۔ ایسی شریف طبیعت کی لڑکی شہر شہر تلاش کرو تو نہ ملے۔ تم اپنے ٹکے وصول کرنے کے لیے، چاہے جو کچھ کہہ دو......"

خاں صاحب نے اپنی بیوی کو گھور کر دیکھا۔ ان کی آواز معمول سے زیادہ بلند ہو گئی تھی اور خاں صاحب کو اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی محلے والا ان کی باتیں نہ سن لے۔ خاں صاحب کی بیوی نے جب خالہ کے سامنے بھی اپنے شوہر کی رسوائی منظور نہیں کی تھی تو اب کیسے بے لگام ہو جاتیں۔ برسوں نباہا تھا ایک بار اور ضبط کر گئیں۔

"خیر کچھ بھی ہو" انھوں نے دبی زبان سے کہا "میں سکینہ کی تنخواہ نہیں مانگوں گی، نہ تمھیں مانگنے دوں گی۔"

"تو میری لڑکی واپس کر دو۔"

"واپس بلا لو۔ میرا کیا جاتا ہے۔ مگر روٹی کپڑا نہ ملا تو گھر گھر دُکھڑا روتی پھروں گی۔"

اس دھمکی کا خاں صاحب پر مطلق اثر نہیں ہوا لیکن چاہے جتنی کفایت کی جائے، کچھ نہ کچھ تو سکینہ کی وجہ سے اخراجات میں اضافہ ہونا ضروری تھا۔ خرچ کا نام سن کر ان کے کان کھڑے ہو گئے۔

"اچھا ری اگر تنخواہ نہیں لیتی تو کچھ غلہ روٹی، کپڑا تو مانگ لایا کر۔"

خاں صاحب کی بیوی چپ ہو گئیں۔ خاں صاحب سمجھے کہ وہ راضی ہیں۔

یہ گفتگو رات کے وقت مکان کے چھوٹے سے صحن میں ہوئی تھی۔ گرمی کا موسم تھا۔ خاں صاحب شام ہی سے دو پلنگڑیاں صحن میں بچھوا لیتے تھے۔ مغرب کی نماز سے واپس آتے ہی وہ ٹانگیں پھیلا کر پیٹھ کے بل لیٹ جاتے۔ اللہ ہو اللہ ہو کرتے یا حمد و نعت کی سنی سنائی غلط سلط نظمیں اپنے کریہہ لہجے میں گاتے۔ یہ عبادت کا سلسلہ کھانے تک جاری رہتا۔ اگر کھانے کے بعد فوراً نیند نہ آئی تو پھر اسے شروع کر دیتے یا بیوی کو اپنا فلسفہ سناتے۔ اس روز کے بحث و مباحثے کے غبار سے اپنی اور اپنی بیوی کی طبیعت صاف کرنے کے لئے انھوں نے مناسب سمجھا کہ کچھ بیان کیا جائے۔ ان کی بیوی کئی بار پلنگ سے اٹھ کر اندر چلی گئیں یا چادر میں منہ لپیٹ لیا اور کہا کہ ان کو نیند لگی ہے، لیکن خاں صاحب کی تقریر میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اطاعت اور تابعداری کی خوبیاں بیان کر رہے تھے اور یہ بیان ہمیشہ لمبا ہوتا تھا۔

خاں صاحب نے سوچا تھا کہ ان کی بیوی تنخواہ کی بجائے روٹی دال چاول مانگ لائیں گی اور اولاد کی "پرورش" پر ان کا جو خرچ ہوا تھا اس کی یوں تلافی ہو جائے گی۔ مگر ان کی بیوی نے کچھ بھی مانگنے سے صاف انکار کر دیا۔ تھوڑے دن خاں صاحب نے انتظار کیا اور جب ان کو یقین ہو گیا کہ بیوی کے ذریعے سے ایک

دانہ چاول تک نہ ملے گا تو انھوں نے دوسری ترکیبیں اختیار کیں۔ کبھی بے بلائے خالہ کے یہاں مہمان ہو جاتے۔ کبھی کہتے کہ بازار میں بہت اچھا کپڑا دیکھ آیا ہوں، اگر اجازت ہو تو سکینہ کے لئے دو چار گز خرید لاؤں اور معمولی کپڑا خرید کر اچھے کپڑے کے دام وصول کرتے۔ ہر دوسرے تیسرے دن خالہ سے ایک مختار رکھنے کی درخواست کرتے اور گھنٹوں وہ دشواریاں بیان کرتے جو ایک مختار کے نہ ہونے سے پیش آسکتی تھیں۔ میری خالہ سمجھ گئیں کہ یہ سب سکینہ کی تنخواہ منظور نہ کرنے کی سزا ہے اور ممکن ہے وہ تنگ آکر سکینہ کو اس کے گھر واپس روانہ کر دیتیں۔ اس مصیبت سے سکینہ کو اس کی ماں نے بچا بچا اور بے چاری ہر طرح سے خالہ کو خوش رکھنے کی تدبیریں سوچتی رہتیں۔ جس دن خاں صاحب خالہ کے یہاں مہمان ہوتے وہ آکر کھانا پکا جاتیں۔ اگر کبھی موقع ملتا تو خاں صاحب کی آنکھ بچا کر خیرات کے لئے کچھ نہ کچھ خالہ کے پاس لے آتیں۔ خالہ اگر ان سے کسی بات پر خوش ہوتیں تو وہ یہ کوشش کرتیں کہ خاں صاحب کے بارے میں انھیں جو بدگمانی ہے وہ کم ہو جائے یا کوئی عملی صورت اختیار نہ کرے۔ خالہ کو خاں صاحب کی سیرت پسند تو کبھی تھی نہ ہو سکتی تھی، لیکن ان کی بیوی کے ایثار اور جاں فشانی سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہ خاں صاحب کی بے تمیزیوں اور کمینی حرکتوں سے درگذر کرتی رہیں۔

یوں ہی دو سال گذر گئے۔ خاں صاحب کی بیوی نے جس امید میں پچھلے دو تین سال کاٹے تھے اس کے پورے ہونے کا وقت آ گیا۔ سکینہ جوان ہو گئی تھی اور خالہ یہ دیکھ کر اس کے لئے شوہر تلاش کرنے لگیں۔ اسی سلسلے میں انھیں میرے بچپن کا ایک ساتھی یاد آیا جو صورت اور سیرت کے لحاظ سے خوبیوں اور نیکیوں کا مجموعہ تھا۔

لیکن ابھی تک افلاس کی وجہ سے اس کی شادی نہیں ہو سکی تھی۔ خالہ نے اُسے اپنے یہاں بلوایا۔ بڑی جد و جہد سے اسے کسی دفتر میں نوکر رکھایا اور شادی کے لئے سامان جمع کرنے لگیں۔ انھوں نے ابھی اپنا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا لیکن سکینہ کو وہ اس نوجوان سے پردہ کراتی تھیں اور کوئی رشتے کی لڑکی نہیں تھی جس کی شادی کا سامان مہیا کرنا ضروری تھا۔ یوں خاں صاحب کی بیوی سمجھ گئیں کہ یہ سب سکینہ کے لئے ہو رہا ہے۔ لڑکا بھی انھیں پسند تھا اور وہ دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہونے لگیں کہ اب ان کی تقدیر پلٹی ہے اور برسوں کی جفاکشی کا اب کچھ اجر ملے گا۔

خالہ نے ان سے ابھی تک شادی کے معاملے میں کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔ وہ اس انتظار میں تھیں کہ لڑکے کی آمدنی کا کوئی ذریعہ ہو جائے اور جب اس میں کامیابی ہوئی تو جہیز کی فکر میں پڑ گئیں۔ اسی وجہ سے خاں صاحب کی بیوی نے خاں صاحب سے بھی کچھ نہیں کہا لیکن خاں صاحب کی نظر بہت تیز تھی۔ ایک مرتبہ رات کو جب ان کی بیوی لیٹی محبت کا خواب دیکھ رہی تھیں انھوں نے کہا:۔

"کیوں ری، یہ بی بی کہیں اس لڑکے سے سکینہ کی شادی تو نہ کر بیٹھیں گی؟"

خاں صاحب کی بیوی چونک پڑیں۔

"کیوں؟"

"میں تو اپنی لڑکی سستی دینے والا نہیں .... اس کنگال کے پاس ہے کیا؟"

"سکینہ کے پاس کیا ہے؟"

"سکینہ کے پاس کچھ نہ سہی، ہمیں تو حوصلہ ہے۔"

"کا ہے کا حوصلہ؟"

"وہ حوصلہ جو ہر ماں باپ کو ہوتا ہے۔ کچھ نقد ملے، کچھ مہر ملے۔ ہمارے پاس بھی بڑھاپا کاٹنے کے لئے کچھ روپیہ ہو۔ لڑکی کا کیا، وہ اپنے گھر جاکر بیٹھ رہے گی۔ ہم کو پوچھے گی بھی نہیں۔ اس کی شادی کر کے کیا ہم فاقے کریں گے۔"

خاں صاحب نے اپنی بیوی کو عمر بھر یہ نہیں بتایا تھا کہ ان کی گذر اوقات کا ذریعہ کیا ہے۔ خرچ کرنے کے لئے روز کے روز اپنی گرہ سے نکال کر کچھ دے دیتے یا بازار سے خود خرید لاتے۔ اس لئے جب وہ فاقے کی دھمکی سناتے تو ان کی بیوی کچھ جواب نہ دے سکتیں۔ اب بھی وہ خاموش ہو گئیں اور دیکھا تو دل کو بھی امیدوں سے خالی پایا۔

انھیں یقین تھا کہ خاں صاحب نے اپنے حوصلے پورے کرنے چاہے تو سکینہ کی زندگی برباد ہوگی اور اسے بچانے کی یہی صورت تھی کہ خاں صاحب کا منہ روپیے سے بند کر دیا جائے۔ روپیہ نہ ان کے پاس تھا نہ میری خالہ کے پاس اور خاں صاحب سے جھوٹے وعدے کرنا خطرناک بھی تھا اور مشکل بھی۔ مگر جو ڈوب رہا ہو، وہ تنکے کا بھی سہارا لیتا ہے۔ انھوں نے دوسرے دن میری خالہ سے آکر کہا:-

"بی بی! سکینہ اب ماشاءاللہ جوان ہوگئی ہے۔ آپ ہی کی عنایت سے اس نے پرورش پائی۔ اب خدا کا نام لے کر ایک اور احسان بھی اس پر کیجیے۔"

میری خالہ سمجھ گئیں۔

"بہن میں اسی فکر میں مبتلا ہوں۔ لڑکا ڈھونڈھا ہے۔ اسے نوکری دلوائی ہے۔ اب جہیز کی فکر میں ہوں۔ دیکھو کب تک شادی کی نوبت آتی ہے۔"

"ہاں بی بی لڑکا تو آپ نے بہت اچھا پسند کیا ہے۔ خاں صاحب نے اسے اس نظر سے تو نہیں دیکھا مگر تعریف بہت کر رہے ہیں۔ یہ بھی کہا تھا کہ سکینہ کی اس سے نسبت ٹھہر جائے تو بہت اچھا ہوگا۔" پھر سوچ کر "مگر بی بی نوکری کتنے کی ہے؟"

"ابھی تو تیس روپے ملیں گے۔ سال دو سال بعد شاید ترقی ہو جائے۔"

"بی بی، میں تو دل و جان سے آپ کی شکر گذار ہوں......"

"بہن، میرے بس کی کیا بات تھی۔ یہ تو سب خدا کی دین ہے۔"

"ہاں بی بی یہ سب ٹھیک ہے، جو کچھ کرتا ہے خدا ہی کرتا ہے۔" میری خالہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"مگر بی بی اب ہم بھی بوڑھے ہو چلے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی اور سہارا نہیں۔ ...... خاں صاحب تو کہتے ہیں کہ خدا کی مرضی ہے تو ہم کو کہیں نہ کہیں سے کھانے کو ملتا رہے گا مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تیس روپے میں ہمارا گذر کیسے ہوگا۔"

"اچھا بہن" میری خالہ نے کچھ طنز سے کہا "تم نے ابھی سے پورا حساب بھی لگا لیا۔"

"بی بی، حاجت ہوتی ہے تو آدمی ہر وقت اپنے ٹکے گنتا رہتا ہے۔"

میری خالہ سے خاں صاحب کی بیوی نے کبھی ایسی باتیں نہیں کی تھیں۔ انھیں تو یہ کسی صورت سے معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ خاں صاحب کی بیوی اپنے شوہر کی بے حیائی چھپانے کے لئے آیندہ کے اخلاقی جرموں کو ابھی سے اپنے سر لے رہی ہیں اور وہ بہت خفا ہوئیں۔

"سنو بہن، میرے بس کا جو کچھ ہے وہ میں کر رہی ہوں۔ اگر تمھاری ہوس اسے کم سمجھتی ہے تو جو چاہے کرو۔ میں اس سے دست بردار ہوتی ہوں۔"

خاں صاحب کی بیوی تھوڑی دیر تک روتی رہیں۔ اس کے بعد اُٹھ کر چلی گئیں۔ رات کو انھوں نے خاں صاحب سے کہا:-

"بی بی سو روپیے نقد اور ایک ہزار کا مہر باندھنے پر تیار ہیں مگر نکاح کے بعد۔"

خاں صاحب نے سر ہلا کر جواب دیا:-

"شادی پر سو روپیے دے تو کیا دے اور ہزار کا مہر کون شریف زادی قبول کرے گی۔"

خاں صاحب کی بیوی نے ہمت کر کے جھوٹ بولا تھا سو وہ بھی بے سود رہا۔ اب وہ چادر میں منہ لپیٹ کر رونے لگیں اور روتے روتے سو گئیں۔

دوسرے دن انھوں نے میری خالہ سے جا کر کہا کہ خاں صاحب نے انھیں قائل کر دیا ہے اور جو خالہ مناسب سمجھیں وہی کریں۔

میری خالہ کو بہت تعجب ہوا کہ خاں صاحب یک بارگی اس قدر راضی برضا ہو گئے اور بیوی ہوس کے پھیر میں پڑ گئیں۔ لیکن انھوں نے اس مسئلے پر زیادہ غور نہیں کیا۔ خالہ سے گفتگو میں خاں صاحب کی بیوی نے بہت دنوں تک سکینہ کی شادی کا سوال نہیں چھیڑا مگر خاں صاحب سے ان کی روزمرہ لڑائی ہوتی رہی۔ خاں صاحب خوشی سے تو کبھی اپنی لڑکی تیس روپے کے نوکر سے نہ بیاہتے۔ لیکن یہ ممکن تھا کہ ان کے ہاتھ بندھ جائیں اور عین موقع پر وہ کچھ نہ کر سکیں۔ اسی کی خاں صاحب کی بیوی کوشش کر رہی تھیں۔ ایک دن انھوں نے خاں صاحب سے کہہ دیا کہ وہ سب کچھ طے

کرچکی ہیں اور عنقریب شادی کی تاریخ مقرر ہونے والی ہے۔ اب اگر خاں صاحب نے دخل دیا تو بڑی فضیحتا ہوگی۔ خاں صاحب نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ وہ بھی غافل نہیں بیٹھے رہے تھے۔ انھیں ایک نواب کی خبر ملی تھی جو عیاشی کرتے تھے اور قرض بھی لیتے تھے۔ خاں صاحب ان کے مصاحب بن گئے۔ موقع پا کر بہت اچھے نرخ پر کچھ قرض بھی دے دیا۔ جب بیوی سے یہ اطلاع ملی کہ سکینہ کی شادی ہونے والی ہے تو اس بے چاری کا بھی انھوں نے فیصلہ کر دیا۔ ایک روز شام کو جب ان کی بیوی گھر پر مصروف تھیں تو وہ میری خالہ کے یہاں پہنچے۔ سکینہ کو رات بھر کے لیے گھر لیجانے کی اجازت چاہی اور اسے یکے پر بٹھا کر لے گئے۔

رات کو وہ اکیلے گھر پہنچے تو کھانے میں کچھ دیر ہوگئی تھی۔ بیوی نے انھیں دیکھتے ہی جلدی جلدی کھانا نکالنا شروع کیا مگر بجائے کھانے کے لیے بیٹھنے کے وہ دیا اندر اٹھالے گئے اور گرہ سے نوٹ نکال کر گننے لگے۔ جب گن چکے تو بیوی سے کہا:۔

"دیکھو تو کہہ رہی تھی کہ سکینہ کی شادی سے ہم کو کیا مل سکتا ہے۔ پانچ سو روپیے نقد اور دس ہزار کا مہر لکھوالایا ہوں اور کسی کی کیا مجال ہے کہ کچھ کہے۔ اپنے سامنے نکاح کرایا اور چار گواہوں کے دستخط ہیں۔

بیوی کے ہاتھ سے کفگیر گر پڑا۔ ان کا سر چکر کھانے لگا اور وہ وہیں پتیلیوں کے بیچ میں لیٹ گئیں۔ خاں صاحب نے نہایت اطمینان سے کھانا نکالا کھایا اور حسب معمول ٹانگیں پھیلا کر پیٹھ کے بل لیٹ گئے اور حمد و نعت کی نظمیں پڑھنے لگے۔ آج وہ معمول سے زیادہ مطمئن تھے۔ خدا کی نعمتوں کا بہت شکریہ ادا کیا، کائنات کی گل کاریوں کی بہت تعریف کی اور جب نیند نے ان کی آنکھیں بند کیں تو ان کی

زبان پر یہ شعر تھا ؎

ترا نام قہار جبار ہے مرا نام خاکی گنہ گار ہے

مجھے یہ نہیں معلوم کہ ان کی بیوی کا اس کے بعد کیا انجام ہوا۔ میری خالہ کو انھوں نے پھر کبھی اپنی صورت نہ دکھائی اور اس کے تھوڑے دن بعد ہی میری خالہ کا انتقال بھی ہوگیا۔ مگر خاں صاحب اسی طرح سے محلے پر حاوی رہے۔ ان کے آخری کارنامے نے ان کے وقار کو بہت بڑھا دیا تھا۔ لوگ انھیں اور زیادہ جھک کر سلام کرتے تھے۔ مسجد میں اور زیادہ پابندی سے نماز ہوتی تھی۔

نیا مکان

انسان کو خدا اُسی وقت یاد آتا ہے جب اُس پر کوئی آفت نازل ہوتی ہے۔
ایوب خاں تعلقہ دار کے پیراسے کئی برس سے سمجھا رہے تھے لیکن اس نے اپنی زندگی کا ڈھنگ بدلنے کا ارادہ اسی وقت کیا جب اس کی جوان لڑکی اور دس برس کا لڑکا ایک ہی ہفتے کے اندر انتقال کر گئے اور اُسے اپنی ڈاڑھی میں سفید بال نظر آنے لگے۔

"نئی زندگی نیا مکان" اس نے اپنے دل میں سوچا "جس گھر میں سات پشتوں سے عیاشی ہو رہی ہو وہاں ایک اللہ والا کیسے بسر کر سکتا ہے۔ یہاں رہا تو میں دن بھر میں اپنے نیک ارادے سب بھول جاؤں گا۔"

پرانے مکان میں اس نے رات گذارنا بھی پسند نہ کیا۔ فوراً ایک کوٹھی کرایے پر لی اور خاندانی گھر اپنی آخری "ساقی" بنجیا کو بخش دیا۔ بنجیا کو اب اپنی صورت شکل پر اتنا بھروسہ بھی نہیں رہا تھا، وہ خوشی سے اس پر راضی ہو گئی اور مچھلی کو جال سے چھوڑ دیا۔

ایوب خاں کا نیا مکان بننے لگا۔ اس کے دل پر دوزخ کا خوف طاری تھا، مگر جب نماز پڑھتے پڑھتے ٹانگیں تھک جاتیں تو جی بہلانے کے لئے وہ اپنے نئے مکان کو دیکھنے چلا جاتا۔ مکان بنتے اور بڑھتے دیکھ کر اسے ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے

اس کی دعائیں قبول ہو رہی ہیں اور اس کے کندھوں سے گناہوں کا بوجھ ہلکا ہوتا جاتا ہے۔ مکان اور اس کی روحانی زندگی میں ایک رشتہ سا پیدا ہو گیا جس پر اُسے اکثر تعجب ہوتا تھا لیکن وہ اسے کبھی سمجھ نہ سکا۔

مکان کا بنوانا اس نے اپنے مختار محمد میاں کے سپرد کیا اور وہ روز جاکر اس سے کہتا تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو مکان تیار کرا دے۔

"محمد میاں روپے کا بالکل خیال نہ کرو۔ جتنے مزدور ملیں اس پر لگا دو ضرورت ہو تو قرض لینے پر تیار ہوں۔ میرا ارادہ اب سیدھی سادی زندگی بسر کرنے کا ہے۔ جتنا بھی قرض ہو سب ادا ہو جائے گا۔ محمد میاں تم پھرتی سے کام کراؤ۔ مزدور بہت سے لگا دو۔ میں نئے مکان کی ترس میں مرا جاتا ہوں۔"

ہر شام کو ایوب خاں اور محمد میاں میں یہی سوال و جواب ہوا کرتے تھے۔

"ہاں تو چھتیں........؟"

"حضور بس........ پندرہ روز میں۔"

"اور دیواروں کی لیپ پوت؟"

"اس میں بھی کچھ زیادہ وقت نہیں لگے گا۔"

"محمد میاں ذرا جلدی کروائیے۔ آپ تو ہر روز بس وہی پندرہ دن کا قصہ سناتے ہیں۔"

"جی ہاں حضور...... اب تو کچھ دیر نہیں ہوگی۔"

یہ سوال و جواب مختار کی کوٹھری کے سامنے ہوا کرتے تھے۔ ایوب خاں روز بے صبری میں اپنی چھڑی سے ایک خاص اینٹ کے ٹکڑے کو توڑنے کی کوشش کرتا

اور پھر ادھر اُدھر دیکھ کر موٹر کی طرف چلا جاتا۔

ایک دن جب ایوب خاں دیکھ بھال کے لئے آیا تو مختار نے کہا :-

"حضور اب نواب صلح گنج کی نئی کوٹھی تیار ہوگئی۔ وہاں کے چند مستریوں اور مزدوروں کو میں نے رکھ لیا ہے۔ مستری اچھے ہیں اور اب کام بھی تیز ہوگا۔"

"اچھا۔"

دونوں مکان کا چکر لگانے لگے۔ کل اور آج کا فرق مختار بڑھاوے کے ساتھ بتا رہا تھا۔

"حضور یہ نئے مستری ہیں۔"

مستری اُٹھے اور جھک کر سلام کیا۔

"حضور اچھے تو ہیں ....؟" ایک مستری نے پوچھا۔

ایوب خاں نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا۔ اس کی نظر اور توجہ دوسری طرف تھی .... مستریوں کے پاس ایک جوان لڑکی کھڑی تھی۔ اس نے بجائے آداب بجالانے کے ایوب خاں کی طرف غور سے دیکھا اور اس کے منہ پر کچھ مسکراہٹ سی آگئی۔ ایوب خاں کا بدن کانپ گیا، چہرہ لال ہوگیا۔

"حضور مستری شکایت کرتے ہیں کہ یہ چونا خراب ہے۔ میرے خیال میں کسی اور ٹھیکے دار سے معاملہ کرنا چاہیے۔"

"ہاں۔"

ایوب خاں مختار کی تقریروں کے جواب میں صرف ہاں کرتا رہا۔ مکان کو بھی وہ اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔ جس طرف وہ دیکھتا اس لڑکی کی شوخ آنکھیں اس کی

نظر کا مقابلہ کرتیں اور اس کے کان میں کہیں سے ایک آواز آتی :-

"حضور اچھے تو ہیں ؟"

ایوب خاں سر جھکا لیتا ۔ اگرچہ اسے معلوم تھا کہ وہ لڑکی اور مستری سب اپنے کام میں مشغول ہیں، اس کا دل دھڑک رہا تھا، طبیعت پر قابو بالکل نہیں رہا۔ شراب پینے سے اُسے اختلاج کی شکایت ویسے بھی ہو گئی تھی، اس نئے واقعے نے جو حالات اور جذبات اس کے دل میں پیدا کئے تھے، ان کے جھونکوں میں وہ ایک تنکے کی طرح اِدھر اُدھر چکر کھا رہا تھا۔

لیکن ان خیالات اور جذبات کی اصلیت کیا تھی ؟ ایوب خاں کئی مرتبہ عاشق ہو چکا تھا، حسن اور حسینوں کے انداز کو وہ خوب سمجھتا اور پہچانتا تھا۔ کیا اسی شیطان نے ایک نیا روپ لے کر اس پر حملہ کیا تھا ؟ نہیں یہ عشق نہیں تھا۔ یہاں نہ حسن تھا نہ طلب۔ گھر پہنچتے پہنچتے ایوب خاں کو بالکل یقین ہو گیا تھا کہ وہ عاشق نہیں ہوا ہے مگر پھر یہ گھبراہٹ کیسی ؟ یہ لاچاری کیوں ؟

گھر پہنچتے ہی ایوب خاں نے دو رکعت نماز پڑھی ۔ خدا کی یاد میں وہ کبھی اتنا نہ ڈوبا تھا جتنا اس نماز میں۔ اور یہ عجیب بات تھی کہ ہر دم اس نوجوان مزدورنی کی شوخ آنکھیں اسے تکتی رہیں، اس کا دل دھڑکتا رہا۔ طبیعت کچھ پریشان رہی لیکن عبادت میں کوئی فرق نہ آیا، خدا خفا نہ ہوا۔ وظیفے کے بیچ بیچ میں وہ خوشی کی آہیں بھرتا جاتا تھا، آنکھوں میں آنسو آرہے تھے، اس مریض کی طرح جو کسی لمبی بیماری سے اچھا ہو کر اپنی عافیت کی خوشی منا رہا ہو۔

"عجیب بات ہے ...... عجیب بات ہے ......" اس کے سوا ایوب خاں

کے منہ سے کچھ نہ نکلا۔

سویرے جب وہ سو کر اٹھا تو اپنے آپ کو اس نے ایک بالکل دوسرا آدمی پایا۔ وہ سادہ لباس جسے وہ روزہ، نماز اور وظیفے کی زنجیروں کی ایک کڑی اور اپنے لئے ایک سزا سمجھتا تھا اسے بہت پسند آیا۔ نوکر جب ناشتہ لایا تو اس سے وہ بہت پیار سے بولا اس طرح کہ نوکر گھبرا گیا کیونکہ وہ ایک سوکھا چہرہ اور سرخ آنکھیں دیکھنے کا عادی تھا۔ دو چار لوگ ملنے آئے۔ وہ بھی خوش ہوئے اور یہ رائے لے کر واپس گئے کہ تعلقہ دار صاحب واقعی اللہ والے ہو گئے ہیں۔ ایوب خاں جب مکان دیکھنے گیا تو اس نے بجائے مختار کے ساتھ گھومنے کے مزدوروں سے باتیں کرنا شروع کیں، بالکل اس طرح گویا کہ وہ خود بھی مزدور ہے۔ ایک بڈھا مستری جسے اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اُسے اس دن بہت پسند آیا یہاں تک کہ وہ اس کے پاس بیٹھ گیا اور بے تکلفی سے گفتگو چھیڑ دی۔

"بھئی تم کیا آج سے کام کر رہے ہو......؟"

"ناہیں، ہجور، ہم تو بہت دنن سے ہیاں ہن" مستری نے جواب دیا۔

"میں تو تمھیں آج ہی دیکھ رہا ہوں۔"

"ہجور، گریب آدمن کا کون دیکھت ہے۔ ادی کی کا نجر آوت ہیں" مستری نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں بھائی، ٹھیک کہتے ہو۔" ایوب خاں بجائے اس طعنے پر ناراض ہونے کے اور خوش ہوا۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اپنے اور مستری کے درمیان جو فاصلہ ہے اُسے کم کرے، جو دیوار ہے اُسے گرا دے۔ پہلے اگر وہ اس کی کوشش کرتا تو اس کی سمجھ کام نہ دیتی۔ آج اُسے یہ بات بہت آسان معلوم ہو رہی تھی۔

"ہاں بھئی ٹھیک کہتے ہو" اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "تم یہاں کوئی ایک مہینے سے کام کر رہے ہو اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ تم ہو بھی یا نہیں...... لیکن اب دھیرے دھیرے میری طبیعت بدل رہی ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ہمارے رسولؐ نے کیوں فرمایا ہے کہ امیروں کے لئے جنت میں جانا اتنا ہی مشکل ہے جتنا اونٹ کا سوئی کے ناکے سے نکلنا۔ میں نے اپنی جوانی بڑی بُری طرح گذاری ہے۔ ابھی کچھ دن ہوئے جب میرے دو بچے ایک ہی ہفتے کے اندر مر گئے۔ تب مجھے خیال آیا کہ خدا بھی ایک چیز ہے اور جو خدا کو بھول جاتا ہے اس کا نقصان ہی نقصان ہے۔"

"ہاں حضور، جب ساری دنیا خدائی کی ہے تو خدا کو بھولے سے دنیا کیسے ملے؟" مستری نے اطمینان سے کہا۔

"ہاں ٹھیک کہتے ہو...... اس لئے میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اپنا پرانا مکان جہاں میں امیروں کی طرح رہتا تھا، چھوڑ دوں گا اور اس نئے مکان میں بیٹھ کر اپنے خدا کی عبادت کروں گا۔"

مستری کچھ کہنا چاہتا تھا مگر رک گیا۔ ایوب خاں نے سلسلہ جاری رکھا۔

"میں اب یہاں بالکل غریبوں کی زندگی بسر کروں گا...... غریبوں کے ساتھ رہوں گا...... سب کا دوست، سب کا بھائی......"

ایوب خاں کچھ دیر تک خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ دل کی بات زبان پر آتنی آسانی سے نہیں آتی۔ مستری نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کام شروع کر دیا لیکن دونوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ ان میں دوستی ہو گئی ہے اور دونوں اس سے بہت خوش ہوئے۔ ایوب خاں میں اب کسی قسم کی جھجک نہیں باقی رہی۔

گھومتے گھومتے ایوب خاں اس جگہ پر پہنچا جہاں وہ نوجوان مزدورنی کام کر رہی تھی جس کی آنکھوں اور مسکراہٹ نے اس میں ایک نیا جوش پیدا کر دیا تھا۔ لڑکی نے ایوب خاں پر ایک سرسری نظر ڈالی اور اپنے کام میں لگی رہی لیکن ایوب خاں کو یہ نظر بھی بہت پیاری اور برسوں کی محبت، ہمدردی، دلی دوستی سے بھری معلوم ہوئی۔ اس نے ایک دم میں وہ ظاہر کر دیا جو مہینوں کی دوستی میں نہیں بنایا جا سکتا اور پھر زبان میں وہ قوت اداکہاں جو نگاہوں میں ہوا کرتی ہے۔ کم از کم ایوب خاں اُسے یوں ہی سمجھا۔ اس نے یہ نہیں سوچا کہ مزدورنی اس کی راز داں کیوں بننے لگی۔ ایسی بات آج اس کے دماغ میں سما ہی نہیں سکتی تھی۔ آج وہ سب کا بھائی، سب کا دوست تھا۔ اسے ایک طرح سے توقع تھی کہ ہر مرد اور عورت اس سے اپنی محبت کا اظہار کرے اور اس میں اسے مایوسی نہیں ہوئی۔

مستری اس سے بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے اور ہر روز ان سے باتیں کرنے میں ایوب خاں کو نیا لطف آتا تھا۔ ہر روز وہ نئے جذبات دل میں سمیٹ کر گھر واپس جاتا، جیسے لوگ کوئی قیمتی چیز بغل میں دبا کر لے جاتے ہیں اور اس دولت کو اپنے خدا کے سامنے پیش کرتا۔ عبادت اس کے لئے ایک ملاقات سی ہو گئی جس کو وہ دلچسپ اور پر لطف بنانے کے لئے ہر دن نئی خبریں لاتا، نئی ہنسی ہنستا اور نئے آنسو روتا۔ مستریوں سے گفتگو کرتے ہوئے اُسے ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایسی بات سنائی دیتی جو اسے سچائی اور محبت سے بھری ہوئی معلوم ہوتی۔ اس جوان مزدورنی کی آنکھوں میں جذبات کا ایک ایسا خزانہ تھا کہ ایوب خاں کے دل میں ہر روز ایک نیا ہنگامہ پیدا ہوتا اور اسے سکون اسی وقت ہوتا جب وہ عبادت میں اپنے خدا کو دل کا سارا حال سنا دیتا۔

ایک روز جب مکان تیار ہو چکا تھا اور مستری اندر دیواروں پر چونا لگا رہے تھے تو بڈھے مستری نے جو ایوب خاں سے بالکل آزادی سے گفتگو کرتا تھا مسکرا کر کہا:-

"کہو صاحب، اب بیاہ کب ہوئی ہے؟"

"کیوں"

"ہم کہا کہ پانچ کمرے ہیں۔ ان ماں کون رہی ہے؟ آپ تو دن رات نکاج پڑھت ہیں۔"

ایوب خاں مسکرایا اور کچھ جواب نہ دیا۔ اس کی بیوی کا انتقال کوئی پانچ سال پہلے ہو چکا تھا لیکن اس زمانے میں وہ عیاشی میں ایسا پھنسا ہوا تھا کہ اُسے دوسری شادی کا خیال کبھی نہیں آیا اور نہ کوئی ایسا باپ ملا جو اسے بیٹی دینے پر راضی ہو۔ مستری کے سوال کو اس وقت تو وہ ٹال گیا مگر دل میں یہ بات ٹھہر گئی۔ کمروں کا آخری مرتبہ گشت لگاتے ہوئے اس نے سوچا:-

"کہتا تو دراصل ٹھیک ہے۔ مکان خالی سا رہے گا اور پھر دوسری شادی میں گناہ کیا ہے۔ عیاشی تو میں نے چھوڑ ہی دی ہے...... پہلی بیوی کو میں نے جو تکلیف دی ہے اس کے بدلے ایک دوسری عورت کو اگر خوش کر سکوں تو......

اسے یک بارگی اس جوان مزدورنی کا خیال آگیا۔ ایوب خاں سے وہ اب اس قدر ہل گئی تھی کہ دونوں میں خوب باتیں ہوا کرتی تھیں لیکن اس کی پہلی نگاہ کا جو اثر پڑا تھا اسے وہ کبھی نہیں بھولا اور دل میں اس معمولی مزدورنی کی بہت عزت کرتا رہا۔ آج شادی کی فکر نے اس کے تعلقات کا رنگ بدل دیا۔ اس نے اپنے آپ کو بہت یقین دلانے کی

کوشش کی کہ اس میں کوئی بات نہیں لیکن اس کے پیر اُسے بے اختیار اسی کمرے کی طرف لے چلے جہاں وہ مزدورنی کام کر رہی تھی۔ نئے ارادوں کے ساتھ تازہ دیدار کا شوق پیدا ہوا اور ایوب خاں کی آنکھیں یہ دیکھنا چاہتی تھیں کہ مزدورنی اگر اس کی بیوی ہوئی تو کیسی معلوم ہوگی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے مستریوں سے باتیں شروع کر دیں، کچھ اپنی گھبراہٹ دور کرنے کے لیے، کچھ اس ڈر سے کہ کہیں کسی کو خیال نہ ہو جائے کہ وہ مزدورنی کو دیکھنے آیا ہے۔ لیکن ان ترکیبوں نے زیادہ دیر تک کام نہیں دیا اور چند جملوں کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک نئے مکان اور نئی زندگی کی تصویر تھی۔ کبھی وہ دیکھتا کہ خود عبادت میں مشغول ہے اور اس کی بیوی تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کے کمرے میں ایک نظر ڈال جاتی ہے۔ اور وہ مزدورنی کی طرف دیکھ کر سوچتا کہ یہ نظر کیسی ہوگی۔ کبھی دونوں کھانے پر بیٹھے دکھائی دیتے، بیوی مختلف چیزیں اس کے سامنے پیش کرتی ہوتی اور ایوب خاں اُس مزدورنی کی طرف دیکھ کر سوچتا کہ یہ تواضع کیسی ہوگی۔ کبھی تخیل یہ منظر پیش کرتا کہ دونوں شام کے وقت سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھ رہے ہیں اور ایک کا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں ہے اور دونوں خاموش ہیں۔ پھر ایوب خاں اس مزدورنی کی طرف دیکھ کر سوچتا کہ یہ خاموشی کیسی ہوگی۔ مزدورنی کی حالت، اس کے انداز، اس کی محبت بھری نگاہیں، گھر کے سجانے اور زندگی کے خوش کرنے کے لیے اس سے زیادہ کس چیز کی ضرورت تھی؟ پھر دیس سے وہ روحانی لگاؤ، غریبوں سے وہ دوستی جس کا اس نے کچھ دن پہلے ہی اقرار کیا تھا، ان سب کے قائم رکھنے کی اور کونسی ترکیب ہو سکتی تھی؟ ایوب خاں کا جی چاہنے لگا کہ کسی طرح سے وہ کود پھاند کر اپنی موجودہ حالت سے اس زندگی تک پہنچ جائے جس کی ایک جھلک

اسے ابھی نظر آئی تھی، اپنی امیدیں پوری کرے اور دل کی بے چینی دور کرے۔ لیکن جب وہ گھر پہنچا اور کھانے کے بعد آرام کر کے نماز پڑھنا چاہی تو اُسے ایک عجیب سُستی سی محسوس ہوئی۔ جہاں وہ شوق سے جاتا تھا وہاں آج معلوم ہوتا تھا کہ کوئی زبردستی لئے جا رہا ہے۔ نماز تو اس نے کسی نہ کسی طرح سے ختم کر لی مگر اُسے اس تبدیلی پر حیرت ہوئی۔

"آخر مجھے ہو کیا گیا؟ کیا میں اب پھر اپنے خدا سے منہ پھیر لوں گا؟" اُس نے اپنے آپ سے گھبرا کر پوچھا۔ مگر اس کا کہیں سے جواب نہ ملا اور آخر کار عاجز آکر وہ وظیفے کو چھوڑ چھاڑ اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ اپنی شادی کے سوچ میں تھا اور اسی جوان مزدورنی کی آنکھیں جنھوں نے اس کی عبادت ایسی رسیلی کر دی تھی آج اُسے اپنی طرف بلا رہی تھیں۔ ایوب خاں نے عیاشی سے توبہ کی تھی۔ اس طرح کی محبت سے نہیں کی تھی جو مرد اور عورت کو میاں بیوی بناتی ہے اور ان کو خوش رکھتی ہے۔ لیکن پھر خدا اور اس کے ایک دین دار بندے کے درمیان میں یہ پردہ کیسا پڑ گیا؟ یہ بے گانگی کیوں کر ہو گئی؟ ایوب خاں اس وقت اپنی آیندہ زندگی کی تصویر بنانے میں ایسا مشغول تھا کہ اس سوال پر زیادہ غور کرنے سے بچنا چاہا مگر یہ اندیشہ اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھنے لگا کہ شاید وہ زندگی جس کا وہ اب ارادہ کر رہا تھا، خدا کو پسند نہ ہو۔ جب صرف اس کے خیال نے عبادت سے جی ہٹا دیا تو اس کی اصلیت کہاں پہنچائے گی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایوب خاں کی طبیعت میں جھنجلاہٹ سی پیدا ہو گئی، اس کی خیالی تصویریں سب دھواں بن کر اڑ گئیں اور اس کے دماغ میں اس مسئلے پر بحث چھڑ گئی کہ اُسے مزدورنی سے شادی کرنا چاہیے یا نہیں؟ اس کی اپنی رائے تو شادی کے موافق تھی لیکن پھر اس نے سوچا کہ اور لوگ کیا کہیں گے۔ رشتے داروں اور عزیزوں

کی زبان سے خدا بچائے، وہ تو بے گناہوں کو بھی روز سولی پر چڑھاتے ہیں۔ ایسی حرکت پر تو وہ اس کی دھجیاں اڑا دیں گے، نام مٹی میں ملا دیں گے۔ رشتے دار تو خیر خدا نے اسی لئے پیدا کئے ہیں، ان کو چھوڑئے۔ مزدورنی سے نکاح ہونے کی خبر سن کر کون چپ رہے گا۔ گلی گلی لوگ ہنسی اڑائیں گے اور یہ نوکر چاکر، یہی لوگ جو اس وقت خوف زدہ اور تابع دار معلوم ہوتے ہیں، یہ بھی خوب دانت دکھائیں گے۔ مزدورنی دنیا میں سب سے بدصورت عورت بن جائے گی، وہ سب سے بیوقوف آدمی۔ اور کیا کوئی ڈنڈا لئے، لوگوں کی رائے بدلتا پھرے گا؟ ایوب خاں کے خیالات کا دیر تک یہی رنگ رہا۔ اور جب نوکر نے چائے لانے میں دیر کی تو اسے بالکل یقین ہوگیا کہ شادی کا نتیجہ بڑی رسوائی اور جگ ہنسائی ہوگی۔

ساری شام اور آدھی رات تک ایوب خاں کی طبیعت پریشان رہی۔ کبھی امید نئی زندگی کو اس کے سامنے دل ربا شکلوں میں پیش کرتی تھی، کبھی لوگ اس کی حماقت پر ہنستے ہوئے نظر آتے تھے۔ یہ بھی نہیں ممکن تھا کہ وہ عبادت میں محو ہو کر ان سب جھگڑوں کو بھول جائے کیونکہ اس پر اس کا جی کسی طرح سے راضی نہیں ہوتا تھا۔ آخر کار نیند نے آکر بحث ملتوی کر دی۔

دوسرے دن سویرے جب نئے مکان کو دیکھنے کے لئے جانے کا وقت آیا تو ایوب خاں کا عجیب حال تھا۔ "پہلے تو نئی زندگی کے طریقے کو طے کر لینا چاہئے۔" اس نے سوچا "ورنہ یہ مکان وغیرہ تو سب مذاق ہے۔ وہاں کوئی جا کر کیا کرے۔" مگر نئی زندگی کا مسئلہ طے نہیں ہو سکتا، اس لئے وہ دل بہلانے کے لئے چلا گیا۔

مکان کے اندر مستریوں میں کسی بات پر بڑے زور شور سے بحث ہو رہی تھی۔

ایوب خاں کو دیکھتے ہی بڈھے مستری نے اس کی طرف مخاطب ہو کر کہا:۔

"اور سنیو میاں صاحب! وہ سندوریا بھاگ گئی۔ ڈیڑھ دن کی مجوری چھوڑ چلی گئی......"

"کون سندوریا کون؟" ایوب خاں کو اس جوان مزدورنی کا نام تو معلوم تھا، لیکن وہ یہ خبر سن کر ایسا گھبرایا کہ اس کی سمجھ میں اور کوئی سوال نہ آیا۔

"ارے وہی صاحب جی کی اُس بنگلا جیسی انکھیاں رہیں۔ آپ تو وی کا جانت ہیں۔"

"کیوں! کیسے بھاگ گئی؟"

"ہم کا جانن صاحب!...... ای منگل تو کہت ہیں کہ وہ عاسک ہوئی گئی رہے۔ انہن سے پوچھو۔"

مستری منگل نے اطمینان سے کہا:۔

"صاحب جب سے وہ ہیاں آئی رہے، تب سے یو منٹھو، وہی جی کے ساتھ وہ چلی گئی ہے، وی سے روج کہت رہے کہ ہمرے پاس کان پور ماں مکان ہے، ہمرے ساتھ ہواں بھاگ چلو، ہم مجوری کربا، تم روٹی ٹپکایو۔ وہ سارکا جانے، نہ مائے نہ باپ جی سے صلاح لے۔ کان پور کا نام سن کر وی کے ساتھ بھاگ گئی۔"

"لیکن آخر مزدوری کیوں چھوڑ گئی؟"

منگل نے کچھ ناراض ہو کر کہا:۔

"اب یو صاحب ہم کا جانن۔"

بڈھا مستری بول اُٹھا:۔

"سار کھہ دہس ہوئی ہے کہ کان پور کی گاڑی آجے جات ہے، پھر کبھو نہ ملی ہے۔"

ایوب خاں کا سر چکر کھانے لگا۔ منہ پر بیماروں کی سی مسکراہٹ آگئی۔ بغیر اور کچھ کہے سنے وہ گھر کے باہر نکل آیا اور موٹر میں جا کر بیٹھ گیا۔

"بھئی گھر چلو" اس نے ڈرائیور سے کہا "ذرا گھومتے گھامتے چلنا۔"

موٹر پھاٹک سے باہر نکل گیا اور ایوب خاں نے پیچھے پھر کر نئے مکان پر نظر بھی نہ ڈالی۔

باغبان

واجد حسین صاحب ان لوگوں میں سے تھے جن کی ہمت اور جفاکشی دنیا کی تمام مشکلوں کو آسان کر دیتی ہے۔ گو وہ خاندان کے شریف تھے لیکن باپ دادا کی فضول خرچی نے ساری شرافت خاک میں ملادی تھی اور اُن کے بہت سے عزیز اس وقت بھی نسب نامے پر فخر کرتے اور جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ واجد حسین صاحب کا بچپن آبا و اجداد کی دولت کی داستانیں اور اس دنیا کی شکایتیں سننے میں گذرا جو بیٹے کو برکت دیتی ہے۔ جتنی نصیحتیں ان کے کان میں پڑیں سب اسی کی تعلیم دیتی تھیں کہ حوصلہ کرنا عبث ہے اور اس دولت سے جو چند روز کی مہمان ہو وہ مفلسی بدرجہا بہتر ہے جو قناعت اور توکل سکھائے لیکن عقلمندوں کی قابلیت کے باوجود وہ اپنے حوصلے پست نہ کر سکے، اپنا وطن چھوڑ کر وہ شہر...... احاطہ بمبئی میں جا بسے، محنت کی، کمایا اور جب ۴۵ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا تو وہ اپنی بیوی اور بچیوں کے لئے اتنا روپیہ چھوڑ گئے کہ وہ شہر کے رئیسوں میں شمار ہوتی تھیں۔ دولت کے علاوہ وہ ایک خاص قسم کے خیالات بھی ورثے میں چھوڑ گئے تھے جنھیں ترک کرنا ان کی بیوہ زیب النساء بیگم اتنا ہی برا سمجھتی تھیں جتنا کہ دوسری شادی کر لینا۔ واجد حسین صاحب کا یہ خیال تھا کہ عورتوں کو پردے میں رکھنا ایسا جرم ہے کہ اگر اس کی سزا میں کوئی قوم غلامی اور فاقہ کشی کی مصیبتوں میں مبتلا کر دی جائے تو بھی سمجھنا چاہیے کہ وہ مستحق

چھوٹی۔ انھوں نے رفتہ رفتہ اپنی بیوی کو آزاد اور خود مختار بنا دیا اور مرتے دم وصیت کر گئے کہ ان کی بچیوں کی روحانی نشو و نما بے جا پابندیوں سے نہ روکی جائے اور انھیں تعلیم سے اس قابل بنا دیا جائے کہ دنیا میں اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکیں اور کسی کی دست گیری کی محتاج نہ ہوں۔

واجد حسین صاحب کے انتقال کے وقت ان کی بڑی بیٹی نیاز آٹھ سال کی تھی اور چھوٹی ارجمند چھ سال کی۔ دونوں اسکول میں داخل ہو چکی تھیں اور جب واجد حسین صاحب انھیں نہا دھو کر صاف صاف کپڑے پہن کر اسکول جاتے دیکھتے تو ان کا دل خوشی سے متوالا ہو جاتا اور آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ زیب النسا بیگم کو یہ کیفیت یاد تھی۔ انھوں نے شوہر کی وصیت پر وفاداری سے عمل کیا اور بچیوں کی تعلیم اور تربیت ان کی سب سے گہری آرزو بن گئی۔ جب دونوں لڑکیاں بڑی ہوئیں اور اسکول سے فارغ ہو کر کالج میں داخل ہوئیں تو ہر جگہ مشہور تھا کہ ان کی لیاقت اور سلیقے کا شہر میں جواب نہیں۔ بعض کہتے تھے وہ لڑکیاں نہیں پھول ہیں جنھیں باغبان کی محنت اور محبت نے باغ کی زینت بنا دیا ہے۔ بعض کہتے تھے وہ پھول نہیں لڑکیاں ہیں جن میں تعلیم اور تربیت نے وہ حسن اور دل ربائی پیدا کر دی ہے جو پھولوں میں ہوا کرتی ہے۔

تعریف لوگ دونوں بہنوں کی کیا کرتے تھے لیکن ان میں مشابہت بہت کم تھی۔ نیاز گوری تھی اور ذرا لمبی، ارجمند سانولی اور میانہ قد کی۔ نیاز کے ناک نقشے کوئی خاص خوبی نہ تھی بلکہ مبصر عورتیں یہ بھی کہتی تھیں کہ اس کے منہ کا دہانہ ذرا بڑا ہو گیا ہے، ناک ذرا چھوٹی

رہ گئی ہے، مگر یہ نقص صرف انھیں کو نظر آ سکتے تھے جن کی نگاہ میں نیاز کی شوخ چمکیلی آنکھیں چکا چوند نہ پیدا کر دیتیں، جنھیں اس کی ابروؤں کے خم میں مصوری کا انتہائی کمال دکھائی نہ دیتا۔ ایسے لوگ بہت کم تھے، اور وہ بھی نیاز کی ان خامیوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے، کیونکہ نیاز کے حسن کا انحصار صرف آنکھوں اور ابروؤں پر نہیں تھا، اس کی گرم گفتار، اس کی ہنسی، اور سب سے زیادہ اس کی پُر درد اور سریلی آواز، جو کبھی غزل گا کر سننے والے کو رند بنا دیتی تھی کبھی دوہے گا کر بیراگی، ایسے تیر تھے کہ جن کا نشانہ خطا نہیں کر سکتا تھا۔ ارجمند ان خوبیوں سے محروم تھی لیکن اس کی آنکھیں آبدار اور نرگسی تھیں۔ ناک اونچی اور نازک، منہ پھول جیسا، بال لمبے اور گھونگھر والے اور گھنے، جسم نہایت سڈول جس کی ہر جنبش میں ایک ادا تھی۔ عورتیں تک تسلیم کرتی تھیں کہ حسن کی کوئی صفت نہیں جو اس میں موجود نہیں ہے۔ مگر افسوس ہے یہ حسن جس پر کسی زمانے میں جاگیریں اور جائدادیں اور اہلِ نظر کی زندگیاں نثار ہوتی تھیں اب اس قدر دانی کے لائق نہیں سمجھا جاتا۔ اب لوگ ایسی حسین عورتوں سے شادی کر کے توفیق کے مطابق انھیں کپڑوں اور زیوروں سے سنوارتے ہیں اور ان کے حسن کا کرشمہ صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسرے ان کے شوہروں پر رشک کرتے ہیں۔

نیاز اور ارجمند میں صورت سے زیادہ سیرت کا فرق تھا۔ نیاز بھولی تھی

مگر تنک مزاج، دل کی اتنی اچھی کہ جس شخص سے سابقہ پڑتا اس کی نسبت بہت سی خوبیاں فرض کرلیتی اور جب معلوم ہوجاتا کہ اس میں یہ خوبیاں نہیں تو اس طرح خفا ہوتی گویا اُسے جان بوجھ کر دھوکا دیا گیا ہے۔ اس کی طبیعت بغض اور کینے سے پاک تھی لیکن جیسی وہ تعریف کرنے میں جوشیلی تھی ویسی ہی مذمت کرنے میں تیز۔ جو اُسے پسند آتا اُسے دیوتا بنا دیتی، جو نظر سے گرجاتا اس کے ساتھ اس طرح پیش آتی گویا وہ ایک مجرم ہے جس کی سزا اس کی مجبوریوں کا خیال کرکے معاف کردی گئی ہے۔ اُسے یقین تھا کہ موسیقی کا ہر دل پر اثر ہوتا ہے، ہر انسان کو ازل سے اس فن کے سمجھنے کی قابلیت ملی ہے اور ہر شخص کو حسب استعداد اس کی قدردانی کرنے پر آمادہ ہوجانا چاہیئے۔ اس کا عقیدہ تھا کہ ہر ذی روح ہستی کو انتہائی کمال حاصل کرنے کی آرزو ہمیشہ بے تاب رکھتی ہے، اور جو کوئی جو کچھ کرے اس کا اصل مقصد اپنا اور دوسروں کا روحانی فروغ ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے نیاز مردم شناس نہیں تھی، اس کا دوست بننا معمولی آدمیوں کے لئے بڑی ذمہ داری کا کام تھا۔ تجربہ ہر ہوشیار انسان کو سکھا دیتا ہے کہ اُسے بچپن کی سادگی اور سادہ دلی بچپن کی یادگاروں کے ساتھ بھول جانا چاہیئے، لیکن جس کا دل پاک صاف ہو اُسے یہ سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ دنیا میں بھلائی کے ساتھ برائی کیوں تسلیم کرنا ہوتی ہے، خصوصاً خود انسان کی فطرت میں ان دونوں عناصر کی ایسی آمیزش کیوں کر ہوجاتی ہے کہ ہم انھیں جدا نہیں کرسکتے اور خالص خوبیوں کے مجسمے تلاش کرنا کس لئے بے کار ہے۔ نیاز کے خیرخواہوں نے، نیاز کی ماں نے، نیاز کے تجربے نے سلامت روی کے بنیادی اصول اس کے ذہن نشین کرنے کی لاکھ کوشش کی مگر

وہ نہ ماننا تھا نہ مانی۔

ارجمند کو ایسی ہدایت کی مطلق ضرورت نہ تھی۔ اس کی طبیعت بچپن سے شکی تھی۔ بہن کی محبت پر اُسے اعتبار نہ تھا، بچپن ہی سے وہ گھنی اور ضدی تھی۔ بچپن ہی سے اس نے دل کی بات دل میں رکھنا، بغض اور کینے اور حسد کا بوجھ سنبھالنا سیکھا۔ عمر اور تجربے نے اُسے اور چالاک کردیا اور اس کی مدھ بھری مسکراہٹ اور رسیلی آنکھوں نے جن لوگوں کو لبھایا تھا ان میں بہت کم تھے جو باوجود ثبوت کے یہ ماننے پر تیار ہوجاتے کہ اس کے خمیر میں خالص نسوانی خوبیوں کے علاوہ اور کچھ بھی شامل ہے۔ ارجمند ایسی سیانی اپنی ہوس کی شدت سے ہوگئی تھی، یہ ہوس کہ دنیا کی کوئی نعمت ہاتھ سے نہ جائے نہ شہرت نہ دولت، نہ سکون اور اطمینان۔ اسے رفتہ رفتہ یہ معلوم ہوگیا تھا کہ حسن اور چالاکی کے سوا اس کے پاس اپنی ہوس پوری کرنے کے اور ذریعے نہیں ہیں اور اس نے ان ہتھیاروں کے استعمال میں مہارت حاصل کرلی۔ لیکن اس کا طور طریقہ اتنا صحیح تھا کہ بڑے بڑے نکتہ چیں بھی اس پر کسی طرح کا الزام نہ لگا سکتے تھے۔

نیاز کی سیرت اس کی کشادہ پیشانی پر لکھی ہوئی تھی۔ اس کی جانچ پڑتال کے لئے کوئی مبصری یا کوشش درکار نہ تھی۔ زیب النسا بیگم اسے ہر مناسب موقع پر ٹوکتی تھیں، اسے بےجا حسن ظن کے خطروں سے آگاہ کرتیں، بےجا بدگمانی سمجھا بجھا کر رفع کرتیں، ہر وقت رواداری کے گن گاتیں اور اس کے دل پر جو چوٹیں لگتیں ان کا محبت سے علاج کرتیں، لیکن نیاز کی طبیعت میں ہمواری کسی طرح پیدا

نہ ہو سکی۔ اسے ماں سے محبت بہت تھی۔ ماں سے کوئی بات چھپانا اس کے نزدیک چوری سے بھی برا تھا، مگر یہ خوف کہ ماں کا کہنا ماننے سے اس کی ہمت پست ہو جائے گی رفتہ رفتہ اس کے مضبوط ارادوں میں شامل ہو گیا۔ یہ عقیدہ بھی کوئی راز نہ تھا۔ وہ ماں سے یہ کہتی رہتی تھی کہ اُسے اپنی ہمت اور حوصلے ان تمام نعمتوں سے زیادہ عزیز ہیں جو سلامت روی مہیا کر سکتی ہے اور اس لئے وہ ہر معاملے میں ان کی رائے نہیں مان سکتی۔ زیب النسا بیگم کا اصل مطلب کہ عقل سلیم کے بغیر ہمت اور حوصلے محض سنگ راہ ہیں جن سے آدمی ٹھوکر کھاتا ہے نیاز کے کبھی سمجھ میں نہ آیا، پھر بھی زیب النسا بیگم کو نیاز کی طرف سے زیادہ اندیشہ نہیں تھا۔ نیاز کی عداوت اور دوستی، اس کا اچانک بگڑ بیٹھنا اور پشیمان ہونا، ہر ایک کو اپنا بچپن یاد دلا دیتا تھا۔ اور تجربے نے انسان کو کیسا ہی سخت گیر کیوں نہ بنا دیا ہو، بچوں کو دیکھ کر اس کا دل آپ ہی آپ نرم ہو جاتا ہے۔ ارجمند کی طبیعت زیب النسا کے لئے بہت دنوں تک ایک معمہ رہی اور جب وہ اس کا کسی قدر اندازہ لگا سکیں تو بہت گھبرائیں۔ نیاز کی خود سری اور خفگی میں بھی ایک وفاداری اور سچی محبت تھی جو انھیں ارجمند کی اطاعت گذاری میں نہیں محسوس ہوتی تھی۔ ارجمند کی ہر بات میں سیان پن ہوتا تھا، ہر بات میں ایک مخفی مطلب، نہ نیاز کی طرح خفا ہوتی، نہ روٹھتی، نہ جی کھول کر ہنستی، نہ جی بھر کر روتی تھی۔ وہ ہر چیز میں دونوں بیٹیوں کو برابر کا حصہ دینا چاہتی تھیں لیکن تقسیم کرنے کے بعد یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ ارجمند کو زیادہ مل گیا ہے، نیاز کو کم، چاہے روپیہ ہو، چاہے زیور ہو، چاہے کپڑے۔ نیاز بہت سی فرمائشیں کرتی تھی جن کا صاف

جواب دے دیا جاتا، لیکن کیا مجال تھی کہ ارجمند جو مانگے وہ نہ ملے، جو چاہے وہ نہ ہو، اس وجہ سے نہیں کہ ماں کو اس کا زیادہ خیال تھا بلکہ محض اس لئے کہ وہ مانگنے اور حاصل کرنے کی ترکیبیں جانتی تھی اور ان کے استعمال کرنے میں مشاق تھی۔ جیسے جیسے لڑکیوں کی عمر بڑھتی گئی زیب النسا بیگم کو یقین ہوتا گیا کہ ان کی طبیعتیں بدلنا یا ان کی حسب منشا اصلاح کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ انھوں نے سوچ لیا کہ وہ دونوں ان کے باغ کے پھول ہیں جن کی نگہداشت رکھنا ان کا فرض ہے مگر ان کے رنگ بدلنا نہ ان کے امکان میں ہے نہ سچ پوچھیے تو ان کا کام ہے۔ ایک باتوکل باغبان کی طرح وہ سب کچھ خدا کی مرضی پر چھوڑ بیٹھیں، مگر دل میں کھٹکا ضرور رہا کہ دیکھیں ہوائیں کیسی چلتی ہیں۔

نیاز اور ارجمند جب کالج میں داخل ہوئیں تو ان کا گھر خوش مذاق اور شائستہ طالب علموں کا مرجع بن گیا۔ نیاز کے دل میں بہت سے حوصلے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ ہندوستان کی شریف عورتیں ہمت کرکے گھریلو زندگی کے تنگ حدود سے باہر نکلیں، قومی زندگی کو سدھاریں اور سنواریں، تھیٹروں میں ایکٹ کریں، جلسوں میں گائیں، ملک میں فنون لطیفہ کا معیار بلند کریں اور عصمت کا دامن چھوڑے بغیر اس قابل ہوں کہ اپنی روٹی بھی کما یا کریں۔ یہ حوصلے صرف اس وقت بارآور ہو سکتے ہیں جب کوئی ہمت کرکے پہلا قدم اٹھائے اور پیش قدمی کے نتائج بھگتے۔ نیاز یہ ذمہ لینے پر تیار تھی اور جتنی زیادہ ماں اور جان پہچان کے لوگ اس کی مخالفت کرتے اتنی ہی اس کے جوش کی آگ اور بھڑک اٹھتی۔ اپنی ماں اور نسوانی "عزت آبرو" کے تمام بزدل

یا قدامت پسند حامیوں کو اس نے اپنے حوصلوں کا دشمن سمجھا اور اگر اسے "عزت آبرو" کے معیاروں پر حملہ کرنے کا موقع ملتا تو وہ کبھی نہ چوکتی ۔ اس قسم کی بغاوت نوجوانوں میں بہت مرغوب ہوتی ہے ۔ نیاز کالج میں بہت جلد ہر دل عزیز ہوگئی، اُسے بہت سے ایسے نوجوان مل گئے جنھیں اس کے حوصلوں سے ہمدردی تھی، کچھ ایسے بھی ملے جو اعلیٰ امداد دینے پر راضی تھے ۔ نیاز نے بھی احسان کے بدلے احسان کیا، وہ طالب علموں کے تمام جلسوں میں شریک ہوتی تھی، تقریریں کرتی تھیں اور جب کوئی مہم درپیش ہوتی تو کسی محنت اور جاں فشانی کے کام سے دریغ نہ کرتی ۔ اس کے عوض میں طالب علم اُس کے ڈراموں میں ایکٹ کرنے پر آسانی سے تیار ہو جاتے، اگر وہ کوئی گیت یا ترانہ سنگت میں گوانا چاہتی تو خوش آواز طالب علموں کی کمی نہ ہوتی ۔ جو مصروف رہنا چاہے اس کے لیے بہت سے کام نکل آتے ہیں ۔ نیاز کی طالب علمی کا زمانہ اس کے مشاغل میں دیکھتے دیکھتے گذر گیا ۔

جب تعلیم ختم ہوئی اور دنیا کی امتحاں گاہ میں قدم رکھنے کا وقت آیا تو یک بارگی نیاز کی آنکھیں کھل گئیں ۔ وہ نوجوان جو کسی زمانے میں اس کے مقاصد کے فدائی معلوم ہوتے تھے اپنے ولولے بھول گئے، کسی نے نوکری کرلی، کوئی تجارت میں لگ گیا، کوئی شادی کر کے گرہست بن بیٹھا ۔ نیاز کے یہاں اب بھی بہت سے آیا جایا کرتے تھے، لیکن سب کی فکریں ان کی پیشانیوں پر ایسی صاف لکھی ہوتی تھیں کہ ان سے کسی قسم کی امیدیں رکھنا صریحی ظلم ہوتا ۔ نیاز یہ رنگ دیکھ کر نوجوانوں کی قوم سے خفا ہوگئی،

اور ماں کے سمجھانے پر بھی اس نے خفگی کے اظہار میں ذرا بھی تکلف نہیں برتا۔ اس کے طعنے تشنے کا خوف ایسا تھا کہ سب اس کے یہاں آنے سے ڈرنے لگے اور سوا دو چار کے جنھیں محبت اور وفاداری کھینچ لاتی تھی، نیاز کے یہاں طالب علموں کی آمد و رفت بتدریج بند ہوگئی۔ نیاز نے اپنی طرف سے یہ تہیہ کرلیا کہ وہ دنیا سے کنارہ کش ہوجائے گی اور کچھ دنوں اس نے اس ارادے پر عمل بھی کیا۔ لیکن زیب النسا بیگم کو یہ کب گوارا ہوسکتا تھا کہ اس کی عمر کے بہترین سال گوشہ نشینی میں گذر جائیں۔ شہر کے اکثر خوش حال خاندانوں سے ان کے پہلے سے مراسم تھے۔ جب نیاز نے بی۔اے پاس کرلیا تو انھوں نے کثرت سے دعوت دینا شروع کردیا اور ان کے یہاں دوسرے تیسرے مہمان آنے لگے۔ نیاز دنیاداروں کو بہت ترچھی نگاہوں سے دیکھتی تھی اس خیال سے کہ وہ سب کے سب اپنی روٹی کمانے میں مشغول تھے اور دل کے ایسے ٹھنڈے کہ اس کی ہاں میں ہاں ملانا بھی ان کو بڑی ذمہ داری کا کام معلوم ہوتا تھا۔ اس وجہ سے وہ ماں کی دعوتوں میں صرف برائے نام شریک ہوتی تھی اور مہماں نوازی کا سارا بار ارجمند اور زیب النسا بیگم پر پڑتا تھا۔ لیکن جب اسے طالب علم دوستوں سے قطعی مایوسی ہوگئی تو کچھ دنوں بعد وہ انھیں لوگوں میں اپنے ہمدرد تلاش کرنے پر مجبور ہوئی۔ زیب النسا بیگم نے اس سے ایک دن کہیں کہہ دیا کہ اسے اب دوستی کے بجائے شادی بیاہ کی فکر کرنا چاہیے، تو وہ بہت بگڑی اور کئی روز تک روٹھی رہی۔ لیکن اسے یقین ہوگیا تھا کہ ایسا دوست جو اس کے سے حوصلے رکھتا ہو اور ایک اعلیٰ نصب العین کی خدمت

کو گھر گرہستی اور اولاد پر ترجیح دیتا ہو اسے ملنے کا نہیں۔ اس نے شادی کی رسم کی مخالفت کرنا چھوڑ دی اور امید اس کے دل کو ایک ایسے شوہر کی تصویر دکھا کر بھانے لگی جو اس کی آرزوؤں پر فدا ہو اور اپنی محبت سے اس کی ہمت افزائی کرے۔ مگر یہ اس کا پختہ عقیدہ رہا کہ مردوں کو جانچنے میں وہ سب سے زیادہ اس کا خیال رکھے گی کہ انھیں اس کے حوصلوں سے کتنی ہمدردی ہے اور اگر اسے ہمدرد نہ ملا تو وہ شادی بھی نہ کرے گی۔

اتفاق سے اسی زمانے میں نادر حسین ایک بیرسٹر کا زیب النسا بیگم سے تعارف کرایا گیا۔ وہ انگلستان سے نیا نیا واپس آیا تھا اور ہندوستانی زندگی کی پابندیوں اور مجبوریوں سے وہ ابھی تک اچھی طرح واقف نہیں ہوا تھا۔ ایک مرتبہ کھانے کے بعد نیاز کا گانا سن کر اس نے کہا:۔

"نیاز بہن، آپ کی آواز تو اتنی نفیس ہے کہ میرے خیال میں اگر آپ یورپ کی طرح گانے کے جلسے کرائیں تو بہت کامیابی ہوگی۔ ہندوستان میں خواہ مخواہ موسیقی کا نام بدنام ہوگیا ہے۔ یورپ میں گانا بہت سی شریف عورتوں کا ذریعۂ معاش ہے اور لوگ انھیں برا کہنے کے بجائے اور الٹی ان کی عزت کرتے ہیں۔ بس آپ ہمت کیجئے اور فنِ موسیقی کو بدنامی سے بچائیے۔"

نیاز اچھل پڑی۔ آخر کار وہ شخص مل ہی گیا جس کی اُسے تلاش تھی۔ اس نے نادر حسین کی صورت اور سیرت، مالی حالت اور دنیاوی حوصلوں پر غور کرنا

فضول سمجھا۔ اس جانچ پڑتال کی کیا ضرورت تھی جب اُسے نیاز کے خیالات سے ہمدردی تھی؟ نادر حسین کی دعوت پر دعوت ہونے لگی اور نیاز اس کی آؤ بھگت اس جوش سے کرتی تھی کہ وہ پھولا نہ سماتا تھا۔ ہر ملاقات پر دونوں بیٹھ کر مشورے کرتے، گانے کے جلسوں کے پروگرام بنتے، آمدنی اور خرچ کا حساب کتاب ہوتا۔ لیکن امید اور جوش کی یہ آب و تاب صرف چند روز رہی۔ خاندان والوں نے نادر حسین کو وکالت کرنے پر مجبور کیا۔ وہ آدمی ہوشیار تھا اور تھوڑے عرصے میں اس کے پاس مقدمے اس کثرت سے آنے لگے کہ وہ کامیاب وکیلوں اور بیرسٹروں کی طرح روپیہ کمانے کے سوا اور کسی مصرف کا نہیں رہا۔ اُسے نیاز اور نیاز کے حوصلوں سے وہی دلچسپی رہی جو پہلے تھی لیکن وقت کی تنگی کا یہ عالم تھا کہ وہ اکثر دعوتوں میں شریک ہونے سے معذرت چاہنے لگا اور جب کبھی آتا تو اپنی مصروفیتوں کا دکھڑا روتا۔ نیاز پر بہت گراں گذرا۔ وہ چاہتی تھی کہ نادر حسین اس کے پاس دوسرے تیسرے دن مشورے کے لئے آئے کیونکہ وہ ایک عظیم الشان جلسے کی تدبیریں سوچ رہی تھی جو اُس کے تمام مخالفین کا منہ بند کردے اور اپنی تدبیروں کی سرگرمی میں یہ بھول گئی کہ نادر حسین کو اپنے دنیاوی اغراض بھی ہیں۔ جب نادر حسین نے مجبوراً ہچکچا ہچکچا کر اعتراف کیا کہ وہ اپنے کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے فی الحال جلسے کو کامیاب بنانے کے لئے دوڑ دھوپ نہیں کرسکتا تو نیاز کے دل میں مایوسی اور بدگمانیوں نے ہجوم کیا اور اس نے سمجھ لیا کہ نادر حسین نے

اسے دھوکہ دیا ہے۔ جس وقت نادر حسین نے قطعی طور پر مدد دینے سے انکار کیا سب کھانے پر بیٹھے ہوئے تھے، نیاز کی آنکھوں سے غم اور غصے کی بجلیاں گرنے لگیں۔ عذر کچھ اور کیا گیا تھا اُس نے اپنی طرف سے الزام کچھ لگایا:۔

"نادر بھائی، آپ صاف صاف کہہ کیوں نہیں دیتے کہ آپ کو لوگوں نے ڈرا دیا ہے۔ وقت آپ کے پاس بہت کافی ہے لیکن آپ میری مدد اصل میں کرنا نہیں چاہتے۔"

نادر حسین کو چند لوگوں کے اعتراضات بھی یاد آ گئے اور اُس نے کچھ کمزور لہجے میں جواب دیا۔

"جی ہاں، لوگوں کے سمجھانے سے اس معاملے میں میری رائے بھی ذرا بدل گئی ہے۔"

"تو بس میری اور آپ کی دوستی ختم ہو گئی۔ کاش مجھے پہلے سے معلوم ہوتا کہ آپ پر بھروسہ نہ کرنا چاہیئے۔"

ارجمند چلائی "ارے باجی! آپ یہ کیسی باتیں کرتی ہیں؟" زیب النسا بیگم نے نیاز کو خوب للکارا۔ نیاز منہ پھیرے بیٹھی رہی اور نادر حسین سے بات تک نہ کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنا سا منہ لے کر چلا گیا۔

نیاز کے اوپر اس "دغا بازی" کا اتنا اثر ہوا کہ وہ کچھ دنوں بیمار رہی اور اچھے ہونے کے بعد بھی اس کے خیالات کا رنگ ماتمی

رہا۔ نادر حسین سے اس کی صلح کرادی گئی لیکن اس کی آنکھیں بتادیتی تھیں کہ گو وہ دوستانہ برتاؤ کرنے پر راضی ہے مگر اب اس کے دل میں نادر حسین کی کوئی وقعت نہیں رہی ہے۔ اس کا جی پھر چاہنے لگا کہ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرے۔ دعوتوں کے دن وہ اکثر طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کرلیتی یا اگر مجبوراً شریک ہونا پڑتا تو خاموش بیٹھی رہتی۔ کچھ گانے کی فرمائشیں کی جائیں تو کہہ دیتی کہ گلے میں درد ہے۔

کالج کے دوستوں میں سے اب صرف عبداللہ کبھی کبھی ملاقات کو چلا آتا تھا۔ اس کی عمر قریب تیس سال کے تھی۔ اس کے غیر معمولی لمبے ڈیل اور چوڑے سینے اور دُہرے بدن نے اسے طالب علموں کی صحبت کے لئے ناموزوں بنا دیا تھا اور چونکہ ان اوصاف کے علاوہ اس کے لمبی گھنی ڈاڑھی بھی تھی اس لے اُسے "مولوی" کا خطاب ملا تھا۔ طالب علم اُسے بہت چھیڑا کرتے تھے، زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ موقع بے موقع مسخرے پن کی باتیں کیا کرتا تھا اور انگریزی بہت غلط بولتا تھا۔ نیاز بھی دوسروں کے ساتھ اس کی ہنسی اڑایا کرتی تھی لیکن اسے تجربے سے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ عبداللہ دیکھنے میں چاہے جیسا ہو دراصل وہ نہایت درجہ محبت کیش، وفادار اور جفاکش آدمی ہے اور بہ ظاہر اس کے ایثار کی کوئی انتہا نہیں۔ نیاز اس کا ادب کرنے لگی اور ممکن ہے دونوں میں گہری دوستی ہو جاتی مگر ایک بدطینت طالب علم نے نیاز سے کہہ دیا کہ عبداللہ کا کچھ عرصے پہلے ایک بھنگن سے ناجائز تعلق تھا۔ نیاز نے دریافت کیا تو سب نے اس واقعے کی

تصدیق کی اور عبداللہ نیاز کی نظروں میں بالکل گر گیا۔ اس کا یہاں تک ارادہ ہوا کہ عبداللہ کو گھر میں قدم رکھنے کی ممانعت کر دے مگر زیب النسا بیگم نے اسے روک دیا۔ وہ خود عبداللہ کی خوبیاں معلوم کر چکی تھیں اور جانتی تھیں کہ ایسے آدمی وقت پر بہت کام آتے ہیں۔ اس لئے عبداللہ سے ہمیشہ اچھی طرح پیش آتی تھیں اور جس طرح ہو سکا ظاہر کرتی رہیں کہ اُن کے دل میں اُس کی بہت عزت ہے۔ جب وہ کالج سے فارغ ہوا تو انھوں نے کہہ سن کر اُسے ایک دفتر میں نوکر رکھا دیا اور اس کے علاوہ دو تین خاندانوں میں بچوں کے پڑھانے کے لئے بھی مقرر کرا دیا۔ عبداللہ کو معلوم ہو گیا کہ نیاز اور ارجمند نے اس سے کیوں ملنا چھوڑ دیا ہے۔ اس نے اُن کے رویے کی کوئی شکایت نہیں کی، نہ کبھی اپنی صفائی پیش کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ہفتے عشرے میں وہ زیب النسا بیگم سے ملاقات کرنے آتا تو نیاز اور ارجمند کی خیر و عافیت پوچھ لیتا تھا۔ اس کے سوا اسے ان کے مشاغل سے اور کوئی سروکار نہیں رہتا تھا۔

نادر حسین سے جس روز نیاز خفا ہوئی اس کے دو چار دن بعد ہی عبداللہ سہ پہر کے وقت زیب النسا بیگم سے ملنے آیا۔ وہ ارجمند کو ساتھ لے کر کسی دعوت میں گئی ہوئی تھیں۔ نیاز کو ہلکی سی حرارت تھی، اس لئے وہ گھر پر رہ گئی تھی۔ خادمہ نے عبداللہ کو یہ سب بتا دیا۔ وہ حال دریافت کر کے فوراً چلا جاتا کیونکہ اُسے کوئی اُمید نہیں تھی کہ نیاز اُس سے ملے گی۔ مگر وہ کئی میل سے پیدل چل کر آیا تھا اور ذرا ستانے کی غرض سے تھوڑی دیر ٹھہر گیا۔

خادمہ سمجھی کہ وہ نیاز کے انتظار میں بیٹھا ہے اور اُس نے نیاز کو جا کر اس کی اطلاع کردی۔ نیاز پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ یہ خبر سن کر وہ کچھ دیر سوچتی رہی کہ جائے یا نہ جائے اور پھر جلدی سے اُٹھی، کپڑے بدلے اور گول کمرے میں پہنچ گئی۔ عبداللہ جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ پیچھے سے نیاز کی آواز آئی :-

"السلام علیکم، مولوی صاحب، کہئے کیسے تشریف لائے؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ صرف آپ لوگوں کی خدمت میں سلام عرض کرنے حاضر ہوا تھا۔"

عبداللہ نے بڑھ کر مصافحہ کیا اور پھر ادب سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا۔

"ابھی خادمہ سے معلوم ہوا کہ آپ کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ بہت افسوس ہوا۔ آپ تو ایک زمانے میں ماشاءاللہ انتہائی تندرستی کا نمونہ تھیں۔ یہ بخار کب سے آنے لگا؟"

نیاز نے منہ بنا کر جواب دیا:-

"مولوی صاحب، یہ وہ بخار نہیں ہے جو مچھر کے کاٹنے یا معدے کی خرابی سے ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ایک انسان دوسرے کے ایسا ڈنک مارتا ہے کہ وہ برسوں تڑپتا رہتا ہے۔ میرا بخار اس قسم کا ہے۔"

عبداللہ کو یاد تھا کہ وہ ابھی تک راندۂ درگاہ ہے اور اس کی بے تکلفی پر گستاخی کا شبہ ہوگا لیکن جو سوال زبان پر لانے کی اُسے ہمت نہ تھی وہ اس کی آنکھوں نے پوچھ لیا۔ نیاز اس کی آنکھوں

میں ہمدردی، محبت اور وفاداری کا جلوہ دیکھ کر اپنی پُرانی نفرت بھول گئی اور بے تکلفی سے کہنے لگی :-

"جی ہاں، میری قسمت میں غالباً لکھا ہے کہ جس شخص سے میں ہمدردی اور دوستی کی امید کروں وہی مجھے آخر میں دھوکا دے۔ پہلے کالج کے دوستوں سے مجھے امیدیں تھیں، وہ سب مجھے بھول گئے۔ ابھی ایک بیرسٹر صاحب نے خود ہی وعدے کئے اور خود ہی دغا دے گئے۔"

دونوں کچھ دیر خاموش رہے۔ عبداللہ کو یک بارگی وہ دن یاد آ گئے جب نیاز کی شوخ آنکھیں اور معصوم ہنسی اسے یہاں کی تمام دعوتوں میں کھینچ لاتی تھی، وہ طالب علموں کے فقرے اور گستاخیاں برداشت کرتا تھا۔ نیاز کی بے پروائی اور دوسروں کی حقارت بھری نظروں کے جواب میں خدمت اور ایثار کے تحفے دیتا تھا اور اس کی محبت مسخرے پن کا بھیس بنا کر آتی تھی کہ کوئی اُسے پہچان نہ سکے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ خاموش بیٹھا سوچتا رہے۔ نیاز بھی اپنی ناکامی کے تصور میں محو تھی۔ جب خادمہ ٹھنڈے شربت کے گلاس لائی تو دونوں چونک اُٹھے۔ عبداللہ نے دو چار گھونٹ شربت پی کر کہا :-

"میرے خیال میں آپ بیکار اس معاملے کو اہمیت دیتی ہیں۔ اگر آپ کی خدمت کے لئے ایک بیرسٹر نالائق ثابت ہوا تو اس پر افسوس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کو خدمت اور ایثار کرنے والے خدا کے

فضل سے بہت مل جائیں گے۔"

"آپ کا خیال یہ ہے" نیاز نے مایوسی سے مسکرا کر جواب دیا۔" اور میں سمجھتی ہوں کہ مجھے الو کی طرح کسی قبرستان میں پناہ لینا چاہیئے جہاں نہ کوئی امیدیں دلا کر پھسلا سکے نہ دھوکا دے کر دل کو صدمہ پہنچا سکے۔"

"آخر کیوں؟ آپ ایسے لوگوں سے امیدیں کیوں کیجئے جن پر آپ کو بھروسا نہ ہو۔"

"تو آپ سمجھتے ہیں یہ پہلے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کون آدمی کیسا ہے؟"

"جی ہاں کیوں نہیں؟ بڑی حد تک آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ بنیا اسی شخص کو قرض دیتا ہے جو کچھ رہن یا گروی رکھ سکے۔ اگر کوئی شخص کسی پر اعتماد کرتا ہے تو اُسی صورت میں جب اُسے اپنے یا دوسروں کے تجربے سے معلوم ہو جائے کہ وہ اس کا مستحق ہے۔ میں ایک دفتر میں نوکر ہوں، اگر میں کسی سے تجارت کے لئے روپیہ مانگنے جاؤں اور اُسے معلوم ہو جائے کہ میں نوکری کے ساتھ تجارت بھی کرنا چاہتا ہوں تو وہ مجھے روپیہ نہ دے گا، خواہ وہ مجھے کتنا ہی ایمان دار سمجھتا ہو۔ میں ان بیرسٹر صاحب کے حالات سے واقف نہیں جن کا آپ نے ذکر کیا ہے لیکن وہ غالباً روپیہ کمانے میں مصروف ہیں اور اسے آپ کی خدمت سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ آپ کے کام صرف وہی شخص آسکتا ہے جس کی کوئی اپنی ذاتی غرض نہ ہو۔"

"جی ہاں، یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں" نیاز کچھ سوچ کر بولی "مگر ساتھ ہی

اگر آپ یہ بھی بتادیتے کہ ایسے آدمی کہاں ملتے ہیں تو مجھ پر بڑا احسان ہوتا۔" نیاز کے الفاظ میں کچھ طنز تھا، لہجے میں خلوص۔ عبداللہ سوائے مسکرانے کے اور کچھ جواب نہ دے سکا۔ پھر نیاز ایک بار پوچھ اٹھی ؛۔

"اچھا آپ کے ذاتی اغراض کیا ہیں؟ اگر آپ سے میں مدد چاہوں تو آپ دینے پر تیار رہیں گے؟"

عبداللہ گھبرایا، گھبرا کر مسکرایا، جھوٹ بولنے کے لئے مناسب الفاظ تلاش کرنا چاہے کہ سچی بات زبان سے نکل گئی ؛۔

"میں تو دل و جان سے ادنیٰ سے ادنیٰ خدمت کے لئے سب کچھ نثار کرنے پر تیار ہوں۔ مگر میری حیثیت کیا ہے کہ آپ کی مدد کرنے کا وعدہ کروں۔ مجھے کوئی جانتا نہیں، میرا کوئی اثر نہیں اور آپ جانتی ہیں میں بدنام بھی کافی ہوں۔"

نیاز کے دل پر اس آخری جملے سے بڑی چوٹ لگی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ عبداللہ یہ دیکھ کر بہت پچھتایا، مگر بات منہ سے نکل چکی تھی، نیاز نے اس کے دل کا زخم دیکھ لیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ نیاز خفا ہوگی یا روئے گی، مگر کسی امید نے یکبارگی نیاز کے حوصلوں کو پھر جگا دیا اور وہ کسی نشے سے مست معلوم ہوتی تھی۔

"مولوی صاحب" آپ غریب ہیں اور بدنام ہیں۔ اگر آپ میری وجہ سے ذرا اور غریب یا بدنام ہوگئے تو آپ کا زیادہ نقصان نہ ہوگا بس اب آپ ہی میرے مددگار اور غم گسار بنئے ......"

زیب النسا بیگم اور ارجمند نے دعوت سے واپس آکر دیکھا کہ نیاز بڑے جوش سے تقریر کر رہی ہے۔ اس کے منہ پر ہنسی ہے اور آنکھوں میں چمک، اس کے مقابل کچھ دور عبداللہ سر جھکائے بیٹھا ہے۔ زیب النسا بیگم نے نیاز کی نبض دیکھی تو معلوم ہوا کہ اُسے بہت تیز بخار ہے۔

نیاز کا خیال تھا کہ اس کی خفگی کے بعد نادر حسین شرمندہ ہو کر اس کے یہاں رفتہ رفتہ آنا جانا بند کر دے گا۔ اسے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ گاہے ماہے آنے جانے کی بجائے وہ پابندی سے ہفتے میں دو بار آنے لگا۔ اگر اس کی طبیعت نادر حسین سے بالکل نہ ہٹ گئی ہوتی تو اس معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتی اور اُسے آسانی سے معلوم ہو جاتا کہ دراصل ارجمند سے ملنے آتا ہے۔ یوں بھی وہ زیادہ عرصے تک مغالطے میں نہیں رہی۔ نادر حسین نے زیب النسا بیگم کی موجودگی میں ارجمند کو دو چار تحفے دیے اور ایک دن نیاز کو ارجمند کی انگلی پر انگوٹھی دکھائی دی۔ اب سارا معاملہ صاف ہو گیا۔

ارجمند کی طبیعت میں وہ بے تکلفی نہیں تھی جس نے اسکول اور کالج میں نیاز کی واقفیت کا دائرہ اس قدر وسیع کر دیا تھا۔ ارجمند اپنی اس خصوصیت سے بہت نالاں تھی کیونکہ اس کی وجہ سے اسے ہر جگہ، ہر مجمع میں نیاز کی ماتحتی اختیار کرنی پڑتی تھی۔ اسے نہ گانے کا شوق تھا، نہ ڈرامے کا، نہ طالب علموں کی صحبت سے دلچسپی، مگر محض اس خوف سے کہ کہیں ساری شہرت اور ہر دل عزیزی نیاز کے حصے میں نہ چلی جائے، وہ ہر چیز میں شریک ہوتی تھی اور نیاز کے مقابلے میں ذہانت اور جوش کی جو اس میں کمی تھی، اُسے اپنے حسن اور مدھ بھری مسکراہٹ اور

ہوشیاری کو کام میں لاکر پورا کرتی تھی۔ اس کے منہ سے نیاز کے خلاف کبھی کوئی لفظ نہیں نکلا، لیکن دیکھنے والا دیکھ سکتا ہے کہ وہ نیاز سے بازی لے جانے کی جی توڑ کوشش کر رہی ہے۔ جب زیب النسا بیگم نے دعوتیں دینا شروع کیا تو اُسے اپنے داؤں پیچ دکھانے کا بہتر موقع ملا۔ نیاز کی طبیعت ان خوش حال مردوں اور عورتوں کو کبھی پسند نہیں آسکتی تھی جو اپنی زندگی آسودگی سے بسر کرنا چاہتی تھیں، جیسے خرانٹ مینڈک ان بچوں کی شرارت نہیں پسند کر سکتا جو اس کی گڑھیا میں گھس کر سبز کائی کی چادر پھاڑ ڈالتے ہیں اور پانی میں وہ اودھم مچاتے ہیں کہ اُسے اپنے مسکن سے جان لے کر بھاگنا پڑتا ہے۔ لیکن ہنر کہاں چھپ سکتا ہے۔ وہی لوگ جو نیاز کی طبیعت سے گھبراتے تھے اس سے بڑی لجاجت سے گانے کی فرمائشیں کیا کرتے تھے اور جب وہ گاتی تھی تو ایسے متاثر ہوتے کہ ارجمند کے "تکلفات اور میٹھی نگاہوں اور مدھ بھری مسکراہٹ اور جادوگری اس کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ ارجمند کا یہ دیکھ کر بہت جی جلتا تھا۔ اس لئے جب کبھی نیاز دعوت میں شریک نہ ہوتی تو اُسے بے حد خوشی ہوتی۔ اگر کبھی نیاز بے وقت رُوٹھ کر مہمانوں کی طرف سے منہ پھیر لیتی تو اس کا دل باغ باغ ہو جاتا، مگر حاسد کی قسمت میں کڑھنا کچھ لکھا ہی ہوتا ہے۔ ارجمند کے سب گرویدہ تھے، اس کے مزاج اور اخلاق کی سب تعریف کرتے تھے، لیکن جس لہجے میں نیاز کے گن گائے جاتے تھے، وہ کچھ اور ہی تھا۔

جان پہچان کے نوجوانوں میں بہت سے ارجمند کی نظر سے گذرے جن کے پاس اتنا روپیہ، جن کے مستقبل میں اتنی چمک تھی کہ وہ ان سے شادی کرنے پر راضی ہو جائے۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی اپنی جھجک انھیں دور رکھتی ہے۔ دراصل

اس کا حسن اور توجہ جو وہ اپنی آرائش کی طرف کرتی تھی انھیں بھڑکا دیتی تھی اور اُس کی آنکھوں میں ایک خود غرضی کی جھلک تھی جو سمجھ دار نوجوانوں کو سلطنتوں کا حسن کے فریب میں آکر برباد ہونا، جائدادوں کا نیلام ہونا اور بھلے آدمیوں کا تباہ ہونا یاد دلا دیتی تھی۔ نیاز خوبصورت نہیں تھی، اُسے لباس اور زیور کا کوئی شوق نہ تھا، وہ نازک مزاج بھی تھی، مگر اس کی سادگی، بے تکلفی، سریلی پر درد آواز اور جوش بھری آنکھیں ہر شخص کو اپنی طرف کھینچتی تھیں اور ارجمند کو دنیا داروں کے حلقے میں بھی مجبوراً دلربائی کی مسند نیاز کے لئے خالی کرنا پڑتی تھی۔

نادر حسین بھی ان لوگوں میں تھا جنھیں ارجمند نے اپنے لئے موزوں قرار دیا تھا۔ شروع میں وہ اس طرح نیاز کے قبضے میں تھا کہ ارجمند ڈورے ڈالنے کی ہمت نہ کر سکی اور اس کے علاوہ وہ اس وقت تک محض ایک خوش حال آدمی کا لڑکا تھا اور اس نے اپنی کمائی سے خاندانی دولت میں کوئی اضافہ نہیں کیا تھا۔ لیکن ارجمند کی نظر اس پر رہی اور جب اسنے دیکھا کہ وہ وکالت میں مصروف ہے، خوب کما رہا ہے اور آیندہ بھی کمائے گا تو اس میں مال دار بیرسٹر کی بیوی بننے کی ہوس نے زور باندھا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ نیاز اسی زمانے میں نادر حسین سے خفا ہوگئی۔ اس نے موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور جب شام کو نیاز کی دوستی ختم ہوئی اس نے اپنی دوستی کی بنیاد ڈالی۔ اسے نادر حسین سے مطلق محبت نہیں تھی، لیکن عاشقانہ گفتگو کی اصطلاحیں سب کو بھلی معلوم ہوتی ہیں، اور ارجمند اپنے دل کی کیفیت چھپانا جانتی تھی۔ اس نے جو انداز اختیار کیا اُس سے نادر حسین کو یقین ہوگیا کہ اُسے بہت اچھا مال سستا مل رہا ہے اور اُسے نہ رقیب

کا مقابلہ کرنا ہوگا، نہ کسی چور کا اندیشہ رہے گا۔ ارجمند کی آنکھیں اسے کبھی کبھی ڈرا ضرور دیتی تھیں، اس کے دل میں کچھ کھٹکا سا تھا جسے اس کی عقل سمجھا نہ سکی۔ مگر دوسرے زیادہ قوی جذبات اس کی طبیعت پر حاوی ہو گئے۔ اس کے اندیشے دور کے بادلوں کی گرج بن گئے، جن کے برسنے کا خوف رفتہ رفتہ جاتا رہا۔

ارجمند اور نادر حسین میں جو تعلقات قائم ہو گئے تھے ان سے نیاز کو کوئی شکایت نہیں تھی۔ نادر حسین سے وہ مایوس ہو چکی تھی۔ ارجمند سے اُسے ہمدردی یا مدد کی کوئی امید نہیں تھی۔ اس کا دل کینے سے بالکل پاک تھا اور اس لئے وہ دونوں اپنی زندگیوں کے بارے میں جو کچھ طے کرتے اُسے وہ خلوص سے تسلیم کرنے پر تیار رہتی۔ اُسے اس زمانے میں ایک دوست بھی مل گیا تھا جس کی وہ دل سے عزت کرتی تھی، جو اُس کے تصور میں ان تمام خوبیوں کا مجسمہ بن گیا تھا جو کسی انسان میں پائی جا سکتی تھیں۔ خود عبداللہ اس اتفاقی ملاقات کے بعد جب نیاز نے انتہائی سادہ دلی اور جوش سے اسے اپنا دوست اور مددگار بنایا تھا بہت پریشان رہا۔ وہ اس ذمہ داری سے نہیں گھبراتا تھا جو نیاز نے اس پر ڈال دی تھی۔ اسے اس کا یقین نہیں تھا کہ نیاز وہ صدمے برداشت کر سکے گی جو دنیا انقلاب کے ہراولوں کو ہمیشہ پہنچاتی ہے۔ نیاز سے اُسے جو محبت تھی اس کا یہی تقاضا تھا کہ کسی طرح نیاز اپنے حوصلوں کو عملی صورت دینے سے روکی جائے، اس لئے اس نے نیاز کو بدنامی سے، لوگوں کی تحقیر سے، بے عزتی سے بہت ڈرایا مگر یہ سب تدبیریں بے کار ثابت ہوئیں۔ نیاز سب کچھ سن کر آخر میں پوچھتی تھی،

"میں نے مانا آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ ہوگا، مگر کیا آپ اس کی وجہ سے

میرا ساتھ چھوڑ دیں گے؟"

اور عبداللہ اپنی زبان کو جھوٹ بولنے پر آمادہ نہیں کر پاتا تھا۔ بطور آخری کوشش کے اس نے سارا معاملہ زیب النسا بیگم کے سامنے پیش کر دیا۔ زیب النسا بیگم دل میں تو ہرگز نہیں چاہتی تھیں کہ نیاز مفت میں مصیبتیں اُٹھائے لیکن وہ یہ بھی گوارا نہیں کر سکتی تھیں کہ محض ان کی مخالفت اس کے حوصلوں کی کمر توڑ دے۔ انھیں امید تھی کہ نیاز کو بہت جلد ایک ہمدرد شوہر مل جائے گا اور اگر وہ اپنے حوصلے پورے نہ کر سکی تو شوہر اور اولاد کی محبت ناکامی کی یاد بھلا دے گی۔ نادر حسین اور نیاز کی دوستی کا رنگ پہلے ایسا تھا کہ وہ سمجھیں نیاز اس سے شادی کرے گی۔ ان کے ایک دوسرے سے خفا ہونے کا رنج سب سے زیادہ انھیں کو ہوا اور ارجمند نے جس خود غرضی سے ان دونوں کو پھر میں ملاپ کرنے کا موقع نہیں دیا وہ انھیں بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ نیاز کا مایوس ہو کر اپنے آپ کو یا اپنی نیک نامی کو صدمہ پہنچانا کوئی ناممکن بات نہ تھی، اس لئے وہ نیاز کی ہر کیفیت پر غور کرتی جاتی تھیں، مگر اس کے معاملات میں دخل دینا ان کے اصول کے خلاف تھا۔ عبداللہ نے جب ان کو بتایا کہ نیاز اس سے کیا چاہتی ہے تو انھوں نے پہلے اسی کے ذریعے سے نیاز کو سمجھانا چاہا اور پھر ایک بار اس کی موجودگی میں انھوں نے نیاز سے کہا:۔

"بیٹی، تم نے اپنا دل تو مضبوط کر لیا ہے مگر یہ بھی تو سوچو میرے کمزور دل پر کیا گذرے گی جو تمھاری طبیعت کی ذرا سی ناسازی تک نہیں برداشت کر سکتا۔ تم اگر بدنام ہوئیں تو مجھے قبر میں بھی چین نصیب نہ ہوگا اور پھر یہ بھی تو سوچو، تم نے اپنے حوصلے پورے کرنے کا سامان کتنا کیا ہے۔ ایک بے چارہ عبداللہ جو اپنی روٹی کمانے کے

لئے سارا دن محنت کرتا ہے تمھارے واسطے کیا کیا کرے گا؟ تمھیں بہت سے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانا چاہیے، تمھارے ساتھ دو چار شریف اور خوش حال لڑکیاں شریک ہونا چاہئیں جس سے لوگوں پر کچھ رعب جمے، سب تمھاری کوششوں کو ایک آوارہ لڑکی کا بکھیڑا نہ سمجھ لیں گے جو گھر میں بھلے مانسوں کی طرح رہنے کی بجائے جلسوں میں گاتی پھرتی ہیں۔ اگر دس آدمی تمھارے اوپر انگلیاں اٹھائیں تو دو چار ایسے ہونے چاہئیں، جو تمھاری طرف سے کچھ کہنے پر تیار رہیں۔ اور تمھیں مردوں سے کیا کام؟ تم کو تو عورتوں پر اثر ڈالنا چاہیے۔ اگر تم نے اپنے عقیدوں کی پیروی کر کے بدنامی اٹھائی اور دنیا کی نظروں میں ذلیل ہوئیں تو شریف لڑکیاں ڈر جائیں گی، کوئی تمھاری تقلید نہ کرے گی اور تمھاری محنت اور جفاکشی اور رسوائی سے کسی خدا کی بندی کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ میں نے آج تک تمھاری مخالفت نہیں کی ہے لیکن سچ پوچھو تو تم نے ذرا بھی دوراندیشی سے کام نہیں لیا۔ سب سے لڑتی جھگڑتی ہو اور تمھاری بدمزاجی سے سب نالاں ہیں۔ ٹھیک طریقہ تو یہ ہے کہ تم اپنی جان پہچان کے لوگوں کو خوش کرو، سب کے دلوں میں اپنی محبت پیدا کرو، پھر وہ آپ ہی تمھاری مدد کریں گے، تمھیں کامیابی کی دعائیں دیں گے اور تمھارے بعد اگر کوئی غریب اور شریف لڑکی گانے کا پیشہ اختیار کرے گی تو اسے معلوم ہوگا کہ واقعی کوئی خدا کی بندی اس کی مشکلیں آسان کر گئی ہے۔ میں برسوں سے فکر میں ہوں کہ تم نام پیدا کرو، مگر بیٹی، تمھاری تو سمجھ ہی کچھ ایسی الٹی ہے کہ تم مجھے اپنا دشمن سمجھتی ہو اور جن لوگوں سے میں تمھاری تعریف کرانا چاہتی ہوں انھیں کے منہ سے تم مجھے شکایتیں سنواتی ہو۔"

زیب النسا بیگم کی تقریر میں بے ترتیبی بہت تھی مگر وہ کارگر ہوئی۔ نیاز اس

وقت کچھ نہیں بولی۔ شام کو جو مہمان آئے ان سے خوب میٹھی میٹھی باتیں کیں اور انھیں جی بھر کر گانا سنایا مگر اس کی سادہ دلی کا اندازہ ابھی تک زیب النسا بیگم کو نہیں ہوا تھا۔ رات کو گیارہ بجے کے قریب وہ سونے کے لئے لیٹیں تو نیاز کمرے میں آئی، ان کے گلے سے لپٹ گئی اور چپکے چپکے رونے لگی۔ انھوں نے پیار کیا، سر سہلایا، رونے کی وجہ پوچھتی رہیں مگر نیاز کے منہ سے آواز ہی نہ نکلی۔ آخر کار اس نے تکیے میں منہ چھپا کر کہا:-

"اماں! ہم مولوی صاحب سے شادی کریں گے۔"

یہ سنتے ہی معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے زیب النسا بیگم کا گلا گھونٹ دیا۔ ان کے دل کا دھڑکنا بند ہو گیا، آنکھیں حلقوں سے نکلی پڑتی تھیں، حواس گم تھے۔ تھوڑی دیر بعد جب صدمے کا اثر کم ہوا تو انھوں نے نیاز کی بانہہ اپنے گلے سے ہٹائی اور کچھ مایوسی، کچھ غصے کے لہجے میں بولیں:-

"نیاز کیا بالکل ہی پاگل ہو گئی ہے؟ اچھے بھلے نوجوانوں سے جو تجھے کھلا پلا سکتے ہیں ذرا ذرا سی بات پر روٹھ جاتی ہے۔ کبھی کہتی ہے گانے والی کا پیشہ اختیار کرے گی، کبھی ایک غریب آدمی سے شادی کر کے اس کی جان مصیبت میں ڈالنے پر تل جاتی ہے۔ اری ذرا ہوش حواس درست کر، تجھے ہو کیا گیا ہے؟"

نیاز نے تکیے میں اور منہ چھپا کر جواب دیا:-

"اماں ہم کو امیر آدمی نہیں چاہیے۔ ہمارے حوصلے صرف غریب آدمی پورے کر سکتا ہے۔"

"ہاں غریب اور کیسا غریب! بے چارے پر کسی نے الزام لگا دیا کہ کھٹگن سے

تعلق رہ چکا ہے تو ایسی بگڑی کہ کتے کی طرح ڈنکارنے پر تیار ہوگئی۔ اب خدا جانے کیسے اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ تو تو اپنی زندگی بگاڑ کر چھوڑے گی۔ تجھے میں کیا سمجھاؤں۔ مجھے اس بیچارے پر ترس آتا ہے۔ اس میں کیا بوتا ہے کہ تیرے ناز نخرے برداشت کرے۔ تو اس سے دو چار دن میں خفا ہوکر کہہ دے گی کہ جائیے ہماری دوستی ختم ہوگئی اور اپنے گھر بھاگ آئے گی۔ اس بے چارے پر مفت میں ایک شریف زادی کے بہکانے کا الزام لگے گا۔ لوگ کہیں گے اس نے تجھے دھوکا دے کر تیری زندگی برباد کی ...... تو تو ایسی خود غرض نہیں ہے، ذرا دوسرے کی نیک نامی کا خیال کر۔"

نیاز نے تکیے پر سے سر نہیں اٹھایا۔ وہیں روتے روتے سوگئی۔ سویرے جب اس کی آنکھ کھلی تو زیب النسا بیگم اسے بڑی محبت سے پیار کر رہی تھیں۔

اس دن سے زیب النسا بیگم سے زیادہ نیاز کے حوصلوں کا ہمدرد اور خیر خواہ کوئی نہ تھا۔ نیاز منہ ہاتھ دھوکر ناشتے کے لئے آئی تو انھوں نے کہا:۔

"دیکھ لڑکی تو سمجھتی ہے میں سٹھیا گئی ہوں۔ اب میں تجھے بتاؤں گی کہ سمجھ دار آدمی اپنا مطلب کیسے حاصل کرتے ہیں۔ ناشتے کے بعد تجھے بٹھا کر ڈیڑھ سو دعوت نامے لکھاؤں گی۔ دعوت نامے لکھا کر تجھے جتنی غزلیں اور گیت یاد ہیں سب سنوں گی اور جو مجھے پسند آئیں گی ان کی روزانہ دعوت کے دن تک مشق کراؤں گی۔ جب تو دعوت میں سب کو غزلیں سنا کر خوش کر چکے گی تو تیری ہمدردی میں ایک تقریر کروں گی اور پھر دیکھیں گے کہ گانے کا عام جلسہ کرنے کا کون مخالف ہوتا ہے۔ جب تو نے ایک جلسہ کامیاب

کر دیا اور تمام اخباروں نے تیری تعریف کر دی تو پھر کیا باقی رہے گا۔ تیرا جی چاہے باپ کی کمائی پر بسر کر، جی چاہے اپنی روٹی ڈ کما، تو ایسی ضدی نہ ہوتی تو یہ سب کب کا ہو گیا ہوتا۔"

نیاز کی طبیعت میں شک بالکل نہیں تھا۔ ماں کی باتیں سن کر خوشی سے پھول گئی اور جلدی جلدی ناشتہ کر کے دعوت نامے لکھنا شروع کیا۔

"دیکھو نیاز" زیب النسا بیگم نے اچانک کہا "عبداللہ کو ضرور بلانا۔"

نیاز نے ماں کی طرف غور سے دیکھا۔ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ ماں سے جا کر بڑی محبت سے لپٹ گئی۔ انھوں نے شادی کی مخالفت کی بھی تو کیا ہوا، نیاز کو یقین ہو گیا کہ انھیں اس سے اور عبداللہ سے سچی محبت ہے۔ بڑی دعوت کے دن تک نیاز کے دل میں یہ یقین ہوتا گیا اور ماں کا اصل منشا بھی اس کی سمجھ میں آگیا۔ اس نے عبداللہ سے شادی کرنے کا خیال تو چھوڑ دیا مگر وہ الفت جس نے یہ خیال پیدا کیا تھا اس کے جذبات کا جوہر بن گئی، ایک زیور جس نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا، ایک خوشبو جس میں اس کا جسم ہر وقت لبا رہتا تھا۔ جب دعوت کا دن آیا تو نیاز ایک نئی زندگی شروع کرنے پر تیار تھی۔

زیب النسا بیگم نے مہمان بہت چن چن کر بلائے تھے، صرف ایسے نہیں جو محض امیر تھے یا ایسے جو ہر تجویز کی تائید کرنے پر راضی ہوں اور تائید کے سوا اور کسی قسم کی مدد دینے میں سستی یا غفلت کریں۔ نیاز کی آواز بھی خوب رنگ پر تھی۔ غزلوں اور گیتوں کے بیچ بیچ میں زیب النسا بیگم نے مہمانوں کو اس کے

ارادے سمجھائے۔ جو اختلاف رائے ان کی تقریریں نہیں مٹا سکیں، اسے نیاز کے نغموں نے خاموش کر دیا اور جب مجلس برخاست ہوئی تو سب نے نیاز کی ہمت افزائی کی اور حتی الامکان مدد کرنے کا وعدہ بھی کیا۔

مہمانوں کے ہجوم میں نیاز ایک نوجوان کی طرف زیادہ توجہ نہیں کر سکی جسے نادر حسین ساتھ لایا تھا۔ اس کا نام ہدایت اللہ تھا اور وہ اسی صوبے کے ایک بڑے شہر کا رہنے والا تھا۔ انگلستان میں نادر حسین اور وہ قریب ایک سال کے ساتھ رہے تھے اور دونوں میں بہت دوستی ہو گئی تھی۔ وہاں سے واپس ہونے پر وہ اس کوشش میں مبتلا رہا کہ اپنی محنت سے کمائے کھائے اور آبائی جائداد کی آمدنی کا سہارا نہ لے۔ نادر حسین کی طرح وہ بھی بیرسٹر تھا مگر کچھ دنوں وکلا کی صحبت اور مقدمے بازی کی فضا میں رہنے کے بعد اس نے طے کیا کہ اس پیشے کی کمائی مفت خوری سے بھی بدتر ہے اور اسے چھوڑ کر تجارت کے ارادے سے دو چار دوکانیں اور کارخانے قائم کیے مگر اسے معلوم ہو گیا کہ لوگ اُسے طرح طرح کے سبز باغ دکھاتے ہیں، دوکان یا کارخانے کا معائنہ کرا کے یا سنجیدہ چہرہ بنا کر اسے یقین دلا دیتے ہیں کہ اُسے عنقریب دس بارہ فی صدی کا منافع ہونے والا ہے مگر ایسے کسی قسم کا فائدہ نہیں ہوتا۔ وہ ہوشیار آدمی تھا اور صرف چند ہزار کا نقصان اُٹھانے کے بعد اس نے یہ پیشہ بھی ترک کر دیا۔ پھر قبل اس کے کہ وہ اور کوئی مشغلہ تجویز کرے، دولت اور فراغت نے اس پر جادو کر دیا، اور اپنے اچھے ارادے بھول کر وہ آوارہ میموں اور طوائفوں کے پھندے میں پڑ گیا۔ اس راستے پر اس کی روک ٹوک کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ والدین نے اُس کے

ولایت جانے سے پہلے جائداد کے لالچ میں اس کی ایک مدقوق لڑکی سے شادی کردی تھی جو بہت جلد مرگئی اور اس سے جو ایک بچی ہوئی تھی وہ چند دن کی مہمان رہی۔ ہدایت اللہ جب ولایت سے واپس آیا تو اس کے پاس بہت سی دولت تھی جسے خرچ کرنے کے علاوہ اس کی زندگی کا بظاہر اور کوئی مصرف نہ تھا۔ پھر میمیں اور طوائفیں اپنے نصیب کو کیوں دعائیں نہ دیتیں۔

نادرحسین کی جب منگنی ٹھہر گئی تو اس نے ہدایت اللہ کو ارجمند سے ملنے کے لئے بلایا۔ ہدایت اللہ پر اسی زمانے میں عیاشی کی ایک موج گذر چکی تھی، اس زندگی سے اس کی طبیعت سیر ہو گئی تھی اور ایک میم جس کی آشنائی اس کے خیال میں محبت کے درجے تک پہنچ گئی تھی اسے چھوڑ کر کسی راجہ کے پاس چلی گئی تھی۔ ہدایت اللہ نے کچھ اس غرض سے کہ کرنٹی کا ماجرا بھول جائے کچھ عیاشی کا خمار اتارنے کے لئے نادرحسین کی دعوت منظور کرلی۔ اتفاق سے وہ ایسے وقت پہنچا کہ زیب النسا بیگم کی بڑی تقریب میں بھی شریک ہو سکا۔ ارجمند سے مل کر وہ بہت خوش ہوا لیکن ارجمند جیسی لڑکیاں اس نے بہت دیکھی تھیں، کبھی شریف خاندانوں میں، کبھی آوارہ عورتوں کے حلقوں میں۔ نیاز کی صورت اور سیرت سے اُسے ابھی تک سابقہ نہیں پڑا تھا اور اس کی ذہنیت پر عیاشی کا رنگ اس طرح لگ گیا تھا کہ وہ ایسی عورتوں کے وجود ہی کا قائل نہیں رہا تھا۔ نیاز کو دیکھ کر اس کے دل میں نئے ولولے پیدا ہوئے۔ اسے اپنی گذشتہ زندگی یاد کرکے شرم آنے لگی اور اس کے دل میں ایک امید جاگ اُٹھی کہ شاید نیاز کا اثر اس کی بُری عادتیں چھڑا کے اُسے ہوس کے گرداب سے نکال لے اور پھر ایک مہذب

انسان بنا دے۔ اس لئے نادر حسین کے ذریعے سے اس نے دوسرے دن چائے پر اپنی دعوت کرائی اور دل کا پیمانہ امیدوں سے لبریز کر کے گھر واپس ہوا۔

اس کی نیاز سے دوسرے دن ملاقات ہوئی۔ تیسرے دن وہ بن بلائے پہنچ گیا اور چوتھے دن بھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ رویہ درست نہیں ہے۔ اس سے خواہ مخواہ بدگمانی ہوتی ہے۔ مگر اُسے خوف تھا کہ اگر نیاز کی دوستی کا سہارا نہ ملا تو پرانی صحبت میں جاکر وہ پھر عیاشی میں مبتلا ہو جائے گا۔ اپنی کشمکش سے نجات پانے کے لئے اس نے چوتھی ملاقات پر نیاز کو اپنی ساری سرگذشت سنا دی، اپنی مجبوریاں سمجھا دیں اور نیاز جیسی پاک دل عورت کا اس کے اخلاق پر جو اثر پڑ سکتا تھا وہ بھی تبلا دیا۔ ہدایت اللہ نے عیاشی سیکھ لی تھی مگر عیاری اور مکاری سے ابھی تک بالکل بیگانہ تھا اور نیاز سے باتیں کرتے وقت اس کے چہرے اور لہجے سے اتنا خلوص ظاہر ہوتا تھا کہ اگر نیاز نے اپنے قاعدے پر عمل کیا ہوتا تو وہ ہدایت اللہ کو ایک فرشتہ سمجھ لیتی جو دنیا کے فریب میں آگیا ہے اور اس کے ہمراہ فلک پیمائی کرنے کے خواب دیکھنے لگتی۔ مگر پچھلے دنوں وہ اپنی ماں کی تجربہ کاری کی بہت قائل ہو گئی تھی اور اسے اپنی غلطیوں کا بھی کچھ احساس ہو گیا تھا۔ اس موقع پر اس نے اپنے جوش کی لگام تھامی، ہمدردی اور جوش کا اظہار کیا لیکن کسی قسم کا قطعی وعدہ کر کے اپنے آپ کو پابند نہیں کیا۔ زیب النسا بیگم کو معلوم تھا کہ ازدواجی زندگی میں بیوی اگر چاہے تو کتنا اثر ڈال سکتی ہے اور اس لئے جب نیاز نے انھیں ہدایت اللہ کا سارا قصہ سنایا تو انھوں نے اُسے ایک قابل رحم مجرم قرار دے کر نیاز کو اس سے دور دور رہنے کی تاکید نہیں کی۔ ہدایت اللہ کی

صورت میں شائستگی اور شرافت کے آثار ابھی اس قدر باقی تھے کہ اس کے سدھرنے کی امید کی جا سکتی تھی اور اگر ان کو یقین ہو جاتا کہ اس نے اپنا چال چلن درست کر لیا ہے تو وہ نیاز کی اس سے شادی کرنے کی مخالفت نہ کرتیں اس لئے انھوں نے ہدایت اللہ کو تین چار روز بعد چائے پر بلایا اور باتوں باتوں میں اسے مشورہ دیا کہ ان کے شہر میں مکان لے کر دو چار مہینے رہے۔ یوں وہ اپنی صحبت سے پیچھا چھڑا سکے گا اور وہ سب بھی اس سے اکثر مل سکیں گے۔

ہدایت اللہ نے اس تجویز پر عمل کیا اور شہر میں مکان لے کر رہنے لگا۔ اس کا زیب النساء بیگم کے یہاں کثرت سے آنا جانا ہوتا تھا۔ زیادہ تر اس وجہ سے کہ وقت کاٹنے کے لئے وہ نیاز کے گانے کا جلسہ کرانے کے دھندے میں پڑ گیا۔ شہر میں سکونت اختیار کرنے کے ایک مہینے بعد ہی اس نے بڑے اہتمام سے جلسہ کرا بھی دیا۔ جلسے میں بہت لوگ آئے، ٹکٹ بہت بکے، نیاز کی تین سو روپے نقد آمدنی ہوگئی اور اخباروں میں اس کی خوب تعریف بھی چھپی۔ نیاز اپنی کامیابی پر بہت خوش ہوئی اور ہدایت اللہ کے سلیقے اور حسن انتظام اور پاک نیتی پر اسے اتنا اعتماد ہو گیا کہ جب اس نے کوشش جاری رکھنے کی صلاح دی تو وہ فوراً راضی ہوگئی اور ہدایت اللہ نے اپنے شہر میں بھی اسی اہتمام اور کامیابی سے جلسہ کرا دیا۔ نیاز کے حوصلے پورے ہو رہے تھے اور ہدایت اللہ سے اس کی وہ گہری دوستی ہوگئی جس کی دونوں کو اتنی تمنا تھی۔ اس عرصے میں زیب النساء بیگم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ہدایت اللہ پھر شریف اور خوش اخلاق لوگوں کی زندگی بسر کرنے لگا ہے۔ اس نے بدچلنی کے داغ اپنی طبیعت اور اپنے دل سے بالکل مٹا دئیے ہیں اور اب اس کے خلوص اور نیت میں شک کرنا بے جا ہوگا۔ ایک اور خوشی کی بات یہ بھی تھی کہ

اس نے نیاز کے مزاج کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا اور اس سے امید کی جاسکتی تھی کہ بغیر نیاز کا دل دکھائے وہ اسے سادہ دلی کی حماقتوں سے بچاتا رہے گا۔

لیکن زیب النسا بیگم کو مسرت کے دن نصیب نہیں ہوئے۔ ارجمند کی شادی تین مہینے بعد ہونے والی تھی۔ ایک روز نادر حسین نے ان سے شکایت کی کہ ارجمند نے تاریخ ملتوی کرنے کو کہا ہے اور یہ نہیں بتایا کہ کیوں۔ زیب النسا بیگم نے بھی ارجمند سے پوچھا مگر کچھ صاف صاف معلوم نہ ہوسکا۔ ارجمند ایسی بیوقوف نہیں تھی جو اپنے ارادوں کا اعلان کرتی۔ اودھر ہدایت اللہ نیاز کے جلسے کی فکر میں تھا، اُدھر اس نے ماں سے چھپا کر نادر حسین کے ساتھ سینما اور اس کے بعد ناچ دیکھنا شروع کیا اور کسی میم کے یہاں خود ناچنا بھی سیکھ لیا۔ ہدایت اللہ جب نیاز کے جلسوں سے فارغ ہوا تو ارجمند اسے بھی نادر حسین کے ذریعے سے بلا کر ساتھ لے جانے لگی۔ نادر حسین اپنی جھجک اس قدر دور نہ کرسکا کہ خود ارجمند کے ساتھ ناچے۔ اس لئے ارجمند اور ہدایت اللہ ناچتے اور وہ بیٹھا دیکھا کرتا۔ نادر حسین کا قد ہدایت اللہ سے کہیں چھوٹا تھا۔ اس کا جسم سڈول مگر دبلا تھا اور اُسے انداز گفتگو کے وہ راز بھی نہیں معلوم تھے جو دلچسپی اور لگاؤ پیدا کرتے ہیں۔ ہدایت اللہ میں یہ سب صفتیں تھیں اور ان کے علاوہ وہ نادر حسین سے مالدار بھی زیادہ تھا۔ پھر ارجمند کیوں شادی کی تاریخ ملتوی نہ کرتی؟ اُسے خیال تھا کہ اگر اُسے کافی مہلت ملی تو اس کا حسن، اس کی مدھ بھری مسکراہٹ، اس کا ناچ اور سینما کا شوق، ہدایت اللہ کے دل میں نیاز کی جو محبت تھی اس کی بیخ کنی کے لئے کافی ہوگا۔ لیکن جب اُسے ذرا اندیشہ ہوا کہ شاید یوں کام نہ چلے تو اس نے ایک اور ترکیب سوچی۔ وہ معصوم بنی، ایک رات کو نیاز کے پاس جاکر

رونے لگی اور یہ دکھلا کر کہ نیاز اور ہدایت اللہ کی خواہشوں کا اسے کوئی علم نہیں۔ اس نے کہا کہ اس کی طبیعت نادر حسین سے بالکل ہٹ گئی ہے اور وہ ہدایت اللہ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ نیاز کی ایثار پسند طبیعت بھلا یہ کب گوارا کرسکتی تھی کہ اپنی خواہش پوری کرنے کے لئے وہ چھوٹی بہن کی آرزوئیں مٹی میں ملائے۔ اس نے صرف اپنی محبت اور اپنے ارادے چھپائے نہیں بلکہ جوش میں ارجمند سے وعدہ کرلیا کہ وہ نادر حسین کو سمجھادے گی۔ ہدایت اللہ کو اگر خدانخواستہ کوئی تامل ہوا تو اس کو بھی راضی کرے گی اور ارجمند کو لوریاں گا کر سلادیا۔

نیاز نے ایثار تو کیا لیکن اس صدمے کو برداشت نہ کرسکی۔ دوسرے دن شام کو اُسے بہت تیز بخار چڑھا۔ بخار میں نیند آگئی۔ دو بجے رات کے قریب اس کی آنکھ کھلی تو پسینہ جاری تھا اور طبیعت بہت ہلکی تھی۔ اس نے سوچا کہ بخار کسی مرض کی وجہ سے تو نہیں، اس لئے پسینہ نکلنے سے جو الجھن ہورہی تھی اسے دور کرنے کے لئے ٹھنڈے پانی سے نہالی۔ سویرے ڈاکٹر آئے اور کہا اسے نمونیہ ہوگیا ہے اور اس کے بچنے کی بہت کم امید ہے۔

نیاز کی موت نے سب کی زندگی میں بڑا انقلاب پیدا کردیا۔ ہدایت اللہ کے دل میں پھر عیاشی اور آوارہ گردی کی ہوس پیدا ہوگئی۔ نیاز کے تیجے کے بعد ہی اس نے اپنے شہر واپس جاکر شراب نوشی اور ناچ گانے میں نیاز کی یاد بھلانے کا ارادہ کرلیا۔ لیکن نیاز کے مرتے ہی ارجمند کا حسن ایک عجیب طریقے پر نکھر آیا، اس کی مسکراہٹ اور نشیلی ہوگئی۔ اس کے انداز نے ایک بے باکی سیکھ لی جو اس میں پہلے نظر نہیں آتی تھی۔ ہدایت اللہ پر اس کا کچھ ایسا اثر ہوا

کہ وہ اپنا جانا ملتوی کرتا رہا۔ ارجمند اپنی طرف سے اپنی شادی کی تاریخ ملتوی کرتی رہی، یہاں تک کہ نادر حسین نے اس سے شادی کرنے کا خیال فضول سمجھ لیا اور اس سے ملاقات کرنا تک چھوڑ دیا۔ زیب النسا بیگم کو اب زندگی سے مطلق دلچسپی نہیں رہی۔ یہ ممکن تھا کہ دو بیٹیوں کی محبت سے وہ اس ایک کو فیض پہنچائیں جو زندہ تھی اور خوش معلوم ہوتی تھی۔ لیکن خدا جانے انھیں کیسے شبہہ ہوگیا کہ نیاز کی موت کی دراصل ارجمند ذمہ دار ہے۔ انھوں نے ارجمند کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ کبھی یہ خواہش بھی ظاہر نہیں کی کہ وہ ہدایت اللہ سے شادی کرے اور گھر آباد کرے۔ ارجمند نے بھی انھیں اپنے معاملات سے الگ رہنے دیا اور جب اسے یقین ہوگیا کہ نادر حسین اس سے کوئی توقع نہیں رکھتا تو ہدایت اللہ سے شادی کرلی۔ دونوں کی رنگیلی زندگی شہر شہر مشہور ہوگئی، باتصویر اخباروں میں ارجمند کے فوٹو بھی چھپنے لگے اور ارجمند کا نام ملک کی خوش قسمت عورتوں میں شامل ہوگیا۔

زیب النسا بیگم سے صرف عبداللہ کبھی کبھی ملنے آتا تھا اور دونوں گھنٹوں بیٹھ کر نیاز کی باتیں کیا کرتے تھے۔ آخرکار وہ موت کا انتظار کرتے کرتے تھک گئیں اور عبداللہ کے ذریعے سے انھوں نے ایک شریف اور غریب لڑکی تلاش کرکے اسے متبنیٰ کرلیا۔ روز شام کو وہ اس کے ساتھ باغ میں بیٹھتی تھیں، اس کے سر کو پھولوں سے سنوار کر اُسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھتی تھیں اور ان کے دل کے حوصلے اپنی گہری نیند میں کنمناتے تھے۔

باغی

آم کا کنج اور بڑے بابو ان دونوں میں کوئی تعلق بظاہر تو معلوم نہیں ہوتا لیکن ہندوستان باوجود ضرب المثل کثرت کے وحدت کا ملک ہے۔ یہاں ہر چیز دوسری چیز سے رشتہ رکھتی ہے۔ یہ رشتہ ہر شخص کو نظر نہیں آتا لیکن شاعر (یہاں اس لفظ کے وسیع معنی مراد ہیں) کی دروبردر نظر اسے دیکھتی ہے، اور دوسروں کو دکھاتی ہے اور جو دیکھنے سے انکار کرے وہ "باغی" کہلاتا ہے۔ باغی کا مفہوم سمجھنے کے لئے تعزیرات ہند علالت اور کالے پانی کا خیال دل سے نکال دیجئے، اور ذرا دیر کے لئے ناموسِ فطرت کی طرف توجہ کیجئے جو انسان یعنی "کائنات مجمل اور اس کے ماحول یعنی کائنات مفصل" میں ہم آہنگی چاہتا ہے اور جس کی خلاف ورزی "بغاوت" ہے۔ مگر خدا کے لئے ان مسائل میں اس قدر محو نہ ہو جائیے گا کہ قصے کی سادگی، انداز بیان کی دل آویزی اور ایک خاص طرح کی ظرافت جو بجا موجود ہے، نظر سے چھپ جائے۔

(ڈاکٹر سید عابد حسین)

ایک چھوٹے سے دیہاتی اسٹیشن کا ذکر ہے۔ مسافر یہاں بہت کم دیکھنے میں آتے تھے اور گاڑیاں اور بھی کم، لیکن کسی مصلحت سے خداوندانِ تدبیر نے تین ملازمانِ

ریلوے کا یہاں تعین کر رکھا تھا جن کی تفصیل یہ ہے ، ایک اسٹیشن ماسٹر (بڑے بابو)، ایک ٹکٹ بابو اور ایک سگنل والا۔

کشن پرشاد اسٹیشن ماسٹر کشیدہ قامت متین آدمی تھے۔ ان کا چہرہ چوڑا چکلا تھا اور مونچھیں بھری بھری اور کسی قدر نیچے کی طرف مڑی ہوئی ظاہر ہے کہ ان کی ذات گویا اسٹیشن کے مرقعے میں نقش مرکزی تھی۔ یہ اپنی تنہائی کی زندگی پر قانع بلکہ اس میں مگن تھے اور جو کوئی ان کے پرسکون چہرے اور خاموشی بھری آنکھوں پر نظر ڈالتا اسے اس بات پر حیرت بھی نہ ہوتی۔ ان کے چہرے سے غور و فکر، علم و فضل کا اظہار رہوتا تھا، حالانکہ انھوں نے برائے نام تعلیم پائی تھی اور ان کی چمک ان کے کور سواد ساتھیوں کے ساتھ .... تقابل کا نتیجہ تھی

باسو ٹکٹ بابو جو ایک دبلا پتلا نوجوان تھا اور جسے یہ عہدہ اپنے گانوں کے مدرسے میں قابل ترین ریاضی داں ہونے کے صلے میں ملا تھا، اور ہی طرز کا آدمی تھا۔ وہ بہت کمزور قلب کا اختلاجی آدمی تھا، ہمیشہ ہاتھ ملا کرتا تھا اور جب سر جھکا کر چلتا تھا تو معلوم ہوتا تھا گویا وہ ایک بھاری بوجھ پیٹھ پر اٹھائے اپنے بوتے سے زیادہ تیز جا رہا ہے اور اس کا بوجھ بس گرا ہی چاہتا ہے۔ اسے ہر وقت جلدی رہا کرتی تھی اور کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ وہ بڑے بابو سے کوئی بات کہہ کر ان کے جواب کے انتظار میں اور ان کے سکون و اطمینان سے عاجز آ کر جلدی جلدی ان کے گرد پھرتا تھا اور اپنے سوال کو اس وقت تک دہرائے جاتا تھا جب تک جواب نہ مل جاتا۔ سگنل والا ایک قریب کے گانوں کا رہنے والا مسلمان تھا۔ وہ ان دونوں کی صحبت میں بہت کم دکھائی دیتا تھا۔ عام طور پر وہ اپنے کیبن (سگنل کی اونچی کوٹھری) میں بیٹھا کھڑکی میں سے

جھانکا کرتا تھا اور مزے میں اپنا ناریل پیا کرتا تھا۔ وہ بہت خاموش رہتا تھا اور کبھی بڑے بابو یا ٹکٹ بابو سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ ان دونوں کو وہ بشر نہیں بلکہ کسی برتر درجے کی مخلوق سمجھتا تھا۔ اس کا سبب شاید یہ ہوگا کہ وہ بالکل ناخواندہ تھا اور باسوچہ سات برس سے جب سے کہ دونوں کا ساتھ تھا اس کے دل پر یہ نقش کرتا رہا تھا کہ وہ ادنیٰ درجے کا آدمی ہے۔ بڑے بابو کو اس کی صحبت سے احتراز نہ تھا لیکن چونکہ وہ ٹکٹ بابو کی کارروائیوں سے ناواقف تھے اس لئے سمجھا کرتے تھے کہ سگنل والا خود تنہا رہنا پسند کرتا ہے۔

ٹکٹ بابو اپنے اختیارات کے بارے میں ہمیشہ سے گستاخ اور خودسر تھا اور بڑے بابو نے یہ دیکھ کر کہ اس کے فلسفۂ زندگی کے بدلنے کی ساری کوششیں بے کار ہیں اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا، لیکن دراصل ان دونوں کے تعلقات مرغی اور اس کے بچے کے سے تھے۔ یہ بات اس وقت واضح ہو جاتی تھی جب ٹکٹ بابو کسی سبب سے سہم کر اسٹیشن ماسٹر کے چوڑے چکلے جسم کی آڑ ڈھونڈھتا تھا اور ان کے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں چھپ جاتا تھا جیسے مرغی کا بچہ مرغی کے پروں میں۔ جب کوئی بات ایسی نہ ہو جو اسے بڑے بابو کی پناہ ڈھونڈھنے پر مجبور کرے تو وہ ان کے سکون و اطمینان پر جھلایا کرتا تھا اور وہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، وہ اتنا بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اسے ایک نہ بدلنے والی چیز سمجھ کر صبر کرلے بلکہ وہ صدق دل سے یہ سمجھتا تھا کہ اس کے افسر کو یہ خصلت چھوڑ دینا چاہئے جس سے اس کے ماتحتوں کو تکلیف ہوتی ہے اور کاشتکاروں پر رعب نہیں پڑتا۔ خود اس کا نصب العین کچھ اور ہی تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ

اسٹیشن ماسٹر کو ایک قوی ہیکل غضب آلود آنکھوں والا آدمی ہونا چاہئے جو ایک رعب دار وردی پہنے ہو اور جس کے انداز سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ وہ ذرا سی نافرمانی یا بیہودہ پن پر آدمی کو اور نہیں تو اُٹھا کر نگل ضرور جائے گا۔ برخلاف اس کے یہ بڑے بابو جن کی نگرانی میں اسے کام کرنا پڑتا تھا ہمیشہ سکون اور خاموشی کی حالت میں رہتے تھے، کسانوں کو گالی دینا ایک طرف ڈانٹتے تک نہ تھے، ہر شخص کو مہربانی کی نظر سے دیکھتے اور وردی کبھی نہیں پہنتے تھے بلکہ ہمیشہ ایک قمیص پہنے اور ایک لمبی سی دھوتی باندھے نظر آتے اور نیم برہنہ۔ بیوقوف کسانوں کو مرعوب کرنے کے لئے ان کے پاس سوائے ایک ریشمی صدری کے اور کچھ نہ تھا۔

تھوڑے دن پہلے ایک واقعہ پیش آیا تھا جس کے سبب سے ٹکٹ بابو اپنے افسر سے اور بھی زیادہ ناراض ہو گیا تھا اور جتنا وہ پہلے کسانوں کو حقیر سمجھتا تھا اسی قدر اب ان سے خائف تھا اور اس کے دل میں یہ وہم سما گیا تھا کہ جو کسان اسے ملے گا اس کا سر توڑ ڈالے گا، اور جب کبھی اس پر خوف کی کیفیت طاری ہوتی تو وہ ڈر کر بڑے بابو کے پاس جاتا تھا اور ان سے التجا کرتا تھا کہ وہ زیادہ سخت تدابیر اختیار کریں اور کسانوں کے مقابلے میں زیادہ استحکام دکھائیں۔

موسم خزاں کا ایک دن تھا اور سہ پہر کا وقت، آسمان پر بادل گھرا ہوا تھا اور ہوائیں خنکی تھی۔ چونکہ رات کو آٹھ بجے تک کوئی گاڑی نہیں آتی تھی اس لئے بڑے بابو نے طے کیا کہ وہ ٹہلنے کے لئے جائیں گے اور ٹکٹ بابو سے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ ٹکٹ بابو نے ڈرتے ڈرتے کہا "کہاں تک چلیے گا؟" اسے خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو گاڑی کے وقت واپسی نہ ہو سکے۔ بڑے بابو نے نہایت اطمینان سے

ایک آموں کے کنج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو چند سو گز کے فاصلے پر تھا جواب دیا کہ "صرف اس باغ تک۔" ٹکٹ بابو نے کہا کہ "بہت اچھا، لیکن تیز چلیے۔" بڑے بابو نے پوچھا "کیوں؟" ٹکٹ بابو کو اس کے وجوہ پیش کرنے کی ہمت نہیں پڑی اور وہ بڑے بابو کے قدم بہ قدم آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

یہ دونوں کھیتوں کے بیچ میں اُٹھی ہوئی تنگ مینڈ پر جا رہے تھے ٹکٹ بابو کا پیر بار بار پھسل کر کھیت میں جا پڑتا تھا اور وہ انتہائی پھرتی کے ساتھ اچک کر مینڈ پر آجاتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کھیت والا دیکھ لے اور گالیوں کی بوچھار شروع کردے۔ بڑے بابو بھاری بھاری قدم رکھتے ہوئے چل رہے تھے اور ان کا قدم ذرا بھی نہیں ڈگمگاتا تھا، جس پر ٹکٹ بابو کو سخت تعجب تھا۔ وہ اپنے آس پاس کی سب چیزوں پر خاموش مسرت کی نظر ڈال رہے تھے اور نرم اور فرحت بخش ہوا میں گہری سانس لیتے جاتے تھے۔ وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے تھے اس لئے انھیں نہیں معلوم تھا کہ ٹکٹ بابو راستے میں کیا کیا کرتب دکھاتا جا رہا ہے۔

آخر کار وہ کنج میں پہنچ گئے، اور ایک درخت کے نیچے زمین کے ایسے حصے پر بیٹھ گئے، جسے ہوا نے گویا انھیں کی خاطر پتیوں اور خاک سے صاف کردیا تھا۔ بڑے بابو نے ٹکٹ بابو کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "باسو تمھیں معلوم ہے مجھے ایک ایسی چیز کی تلاش تھی جو ہماری قوم اور ہمارے ملک کی تمام اہم خصوصیتوں کا مرکز ہو۔ میں نے بہت ڈھونڈھا لیکن آم کے کنج سے زیادہ معنی خیز مجھے کوئی چیز نہیں ملتی۔ حقیقت میں ہماری زندگی کی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی جھلک تمھیں ان میں نظر نہ آئے۔ آم کے جس کنج کو دیکھو معلوم ہوتا ہے وہ ہمیشہ سے اسی جگہ

موجود تھا جہاں اب ہے۔ کسی کو نہیں معلوم ان درختوں کو کس نے لگایا تھا اور کوئی ایسا بے رحم نہیں جو انھیں کاٹ کر پھینک دے۔ ہماری زندگی ہمیشہ سے ہے اور ہمارا ملک بھی۔ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے، ہمارا ملک دنیا میں ہے اور ہم اس میں رہتے ہیں، باوجود ان شیطانوں اور برہم راکشوں کی مخالفت کے جن کا ذکر ہماری مذہبی کتابوں میں ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر ہمارے یہاں آم کے کنج نہ ہوتے تو ہماری زندگی بڑی بوجھل ہو جاتی۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ خود مجھ پر یہ بات صادق آتی ہے اگر میں اپنی کھڑکی سے اور اسٹیشن سے اتنے آم کے درخت نہ دیکھ سکتا تو میں کب کا مر گیا ہوتا یا نوکری چھوڑ کر چلا گیا ہوتا۔"

ٹکٹ بابو موقع پاتے ہی بول اٹھا "مگر آم کے کنج تو سارے ایک ہی سے ہوتے ہیں۔"

بڑے بابو نے کہا "ہاں اسی طرح سب ہندوستانی قریب قریب ایک سے ہوتے ہیں اور جو دوسری طرح کے ہیں وہ باغی ہیں۔ جو کوئی آم کے کنج کی خوبصورتی کا قائل نہ ہو وہ باغی ہے چاہے وہ کوئی بڑا بھاری انگریز افسر ہی کیوں نہ ہو۔"

ٹکٹ بابو کے ذہن میں باغی کا تصور ایک خوفناک مجرم کا تھا جو پھانسی کا سزاوار ہو اور جس کا تعاقب سارے ملک کی پولیس کر رہی ہو، اور کسی انگریز کے ساتھ یہ بات ناممکن تھی۔ لیکن وہ اس وقت بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے تردید کے لئے صرف سر ہلا دیا۔

ایک منٹ تک خاموشی رہی۔ بڑے بابو نے بابو کے اظہار تردید کی طرف کوئی

توجہ نہ کی۔ وہ اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے تھے اور گہری سانس لیتے ہوئے شوق اور پسندیدگی کی نظر سے ان پتیوں کو دیکھ رہے تھے جو ہوا میں جھکولے کھا رہی تھیں اور تھک کر زمین پر گرنے والی تھیں۔ ٹکٹ بابو اسٹیشن کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ بڑے بابو کب اُٹھیں گے اور واپس چلیں گے۔

آخر بڑے بابو نے مہر خموشی کو توڑا "بغیر ان کنجوں کے واقعی ہم پر بڑی مصیبت ہوتی۔ کہا جاتا ہے کہ گنگا مائی کی وادی جہاں ہم پلے ہیں دو ہزار میل لمبی اور دو سو میل چوڑی ہے۔ ہمارے یہاں پہاڑ نہیں ہیں اور جیٹھ بیساکھ میں بڑی گرمی پڑتی ہے۔ اگر کنج نہ ہوتے تو بھوکے پیاسے مسافر کہاں بیٹھ کر کھاتے اور آرام کرتے۔ ایک درخت سے دھوپ کا کافی بچاؤ نہیں ہوتا اور اس طرح بڑے درخت خود بخود تو مل کر نہیں اُگتے۔"

ٹکٹ بابو نے بات کاٹ کر کہا "اگر مجھ سے پوچھئے تو مجھے یہ کنج دیکھ کر ہمیشہ یہ خیال آتا ہے کہ خدا جانے کتنے سانپ اس کے سایے میں بیٹھے مجھے ڈسنے کو تیار رہیں۔"

بڑے بابو آہستہ سے ہنسے اور بولے "لوگوں کے خیالات میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ جب میں چھوٹا سا تھا تو کبھی کبھی ایسا ہوا ہے کہ میں کئی رات دن اپنے گاؤں کے ایک کنج میں رہا ہوں اور آج تک کبھی مجھے سانپ نے نہیں کاٹا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آدمی کے آس پاس کوسوں تک کوئی کنج نہ ہو اور پھر بھی اسے سانپ ڈس لے۔ سانپ اور کنج میں کوئی چیز مشترک نہیں اور اگر تم سمجھتے ہو کہ دونوں کا ساتھ لازمی ہے تو تم غلطی پر ہو۔ گیا تمھاری طرف

بہت کنج ہوتے ہیں؟"

"نہیں تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ معلوم نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاید ہوتے ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں ہاں مجھے خیال آیا ۔ وہاں بھی اسی کثرت سے ہوتے ہیں جیسے یہاں۔"

بڑے بابو نے پھر سلسلۂ تقریر شروع کیا "ہاں میں بھی یہی سمجھتا تھا ہم سب اصل میں ایک ہیں ۔ میرے نزدیک تمام ہندوستان میں تمدن شہروں میں دیہات سے آیا ہے اور دیہات میں آم کے کنج سے پیدا ہوتا ہے ۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں اسے مان لو ۔ جہاں کسی گانوں میں آم کا کنج ہے وہاں کرشن جی کی پوجا موسیقی بلکہ تمام فنون لطیفہ اور میل ملاپ کے دیوتا کی حیثیت سے ہوتی ہے، اور جہاں آم کے کنج نہیں وہاں دوسرے دیوتا پوجے جاتے ہیں اور وہاں کے لوگ ہندو نہیں بلکہ اگر سچ پوچھو تو سرے سے ہندوستانی نہیں ۔ مجھے اکثر یہ خیال آیا ہے کہ اگر آم کے کنج نہ ہوتے تو شری کرشن جی کا بانسری بجانے یا عشق و محبت کی باتیں کرنے کو جی نہ چاہتا ۔ وہ شیطان کے ہاتھ سے اپنے انسانی جسم کو برباد ہو جانے دیتے اور بہشت کو لوٹ جاتے، اگر چاندنی رات میں جمنا کے کنارے آم کے کنج کے سایے میں سونا ان کے دل کو نہ لبھاتا ۔ گانوں کی زندگی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہندوستان کی زندگی کے لطف کا مرکز آم کا کنج ہے ۔ شاعر کے لب پر کسی شیریں نغمے کا جاری ہونا سوائے اس حالت کے ناممکن ہے کہ وہ آم کے کنج میں بیٹھا ہو، سورج ڈوب رہا ہو، ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہو اور عشق و آرزو کا دل پر نرغہ ہو ۔ اور میرے خیال میں یہی آم کے درخت جھک کر کرشن جی کے کان میں چپکے سے راگ

اور راگنیاں پھونک دیا کرتے تھے۔ یہ اپنی خاص فضا اور اپنی خاص موسیقی رکھتے ہیں اور دن کی ہر گھڑی میں نئے گیت سناتے ہیں۔ اگر تم دن کے کسی حصے میں یہ معلوم کرنا چاہو کہ تم پر کیا کیفیت طاری ہونا چاہیے تو بس تم نزدیک کے کنج میں جا بیٹھو۔ وہاں تمھیں پتیاں مناسب وقت گیت سنائیں گی۔"

جب بڑے بابو یہ کہہ رہے تھے تو وہ آس پاس نظر ڈالتے جاتے تھے، آم کے کنج پر اور اس ناہموار قطعۂ زمین پر جو ان کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ جملے ان کی زبان سے آہستہ آہستہ بلا ارادہ نکل رہے تھے گویا ان پر کسی بڑی طاقت، شاید کنج کی روح کا غلبہ تھا اور وہ ان کے پردے میں بول رہی تھی۔

کچھ عرصے بعد ٹکٹ بابو نے یقین کے لہجے میں کہا "بہت ممکن ہے۔"

"ممکن ہی نہیں بلکہ سچ ہے۔ میں جانتا ہوں کیونکہ میں نے خود انھیں گاتے سنا ہے۔ بس تم لیٹ جاؤ اور کان لگا کر سنو۔ مگر شرط یہ ہے کہ تمھارا قلب صاف ہو اور تم سانپوں کے ڈر سے کانپتے نہ ہو۔" بڑے بابو نے مسکرا کر ٹکٹ بابو کی طرف دیکھا لیکن وہ سہما ہوا سامنے کی جھاڑی کو دیکھ رہا تھا اور اس نے آخر کا جملہ نہیں سنا۔

دونوں ایک منٹ تک خاموش رہے۔ اس عرصے میں قدرت نے بڑے بابو کی ساری آرزوؤں کے پورا کرنے کا انتظام کر دیا۔ مغربی افق پر بادل پھٹ گئے تھے تاکہ سورج اور زمین کو موقع دیں کہ وہ ایک دوسرے کو رخصتی سلام کرلیں۔ چند کرنیں بادل کے گرد گھیرا بناتی ہوئی آم کے کنج پر پڑ رہی تھیں۔

بڑے بابو نے کہا "دیکھو، دیکھو سورج ڈوب رہا ہے۔"

ٹکٹ بابو نے گھبرا کر کہا "تب تو ہمیں چلنا چاہیے۔"

بڑے بابو نے بغیر کچھ کہے اپنی گھڑی نکالی۔ ابھی صرف ساڑھے چھ بجے تھے۔ وہ کہنے لگے "ابھی بہت وقت ہے۔ میں ذرا سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم بھی ٹھہر جاؤ۔"

ہمارے ہندوستان میں غروبِ آفتاب کا منظر عموماً نہایت شاندار ہوتا ہے۔ اس وقت جو لطف تھا وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ بڑے بابو اس پُرشوکت رخصتی کے نظارے میں محو، وجد کے عالم میں خاموش بیٹھے تھے۔ کبھی وہ تاریکی کو افقِ مشرق سے بڑی بڑی لہروں میں بڑھتے ہوئے اور سورج کی شعاعوں میں گم ہوتے ہوئے دیکھتے تھے۔ کبھی کنج کے حسرت خیز سایے پر نظر ڈالتے تھے اور کبھی کسی چھوٹی سی کرن کے تبسم کے جواب میں جو پتیوں سے جھانکتی تھی اور ایک جھلک دکھا کر منہ چھپا لیتی تھی، وہ خود مسکرا دیتے تھے۔

جب سورج سب سے دور کے کنج کے پیچھے غائب ہو گیا تب جا کر بڑے بابو اُٹھے اور پھر بھی بادلِ ناخواستہ، تاسف کے ساتھ۔

ٹکٹ بابو کی حالت پہلے ہی سے غیر تھی۔ شام کو اسے عموماً قلب کے دورے ہوا کرتے تھے۔ تاریکی میں ہمیشہ کوئی چیز ہوتی تھی جو اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی، کوئی چیز جو اس کی دشمن تھی اور اسے سہما دیتی تھی۔ آج اس کے دل میں گاڑی کے وقت نہ پہنچ سکنے کا خوف سمایا ہوا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر گاڑی آ گئی اور اسٹیشن ماسٹر اور ٹکٹ بابو کے نہ ہونے کے سبب دیر تک کھڑی رہی تو غضب ہی ہو جائے گا۔ ہر شخص دونوں کو بُرا بھلا کہے گا، کسان پھاٹک کے اوپر سے پھاند

پھاند کر بلا ٹکٹ اندر داخل ہو جائیں گے۔ ممکن ہے کہ ڈرائیور کو غصہ آجائے وہ بغیر لائن کلیر اور سگنل کے گاڑی چھوڑ دے اور کوئی حادثہ پیش آجائے۔ اس خیال نے تو اس کا خون ہی خشک کر دیا کہ کہیں افسران بالادست نے آج ہی کے دن کو معائنے کے لئے منتخب کر کے کسی انگریز گارڈ کو نہ بھیج دیا ہو کہ وہ سب ملازموں کی کارگذاری کی پوری رپورٹ کرے۔ اگر یہ صورت ہوئی تو کیا ہوگا۔ یہ دیکھ کر کہ اس قسم کا کوئی خیال بڑے بابو کے دل میں نہیں آتا تھا اور وہ اس قدر آہستہ قدم اُٹھا رہے تھے گویا کوئی گاڑی آنے والی نہ تھی، وہ اور جھلاتا تھا، لیکن باوجود اس کے کہ اسے اپنے افسر کی یہ سستی اس قدر ناگوار تھی اُسے اتنی جرأت نہ ہوئی کہ تیز چلنے کو کہے کیونکہ اس صورت میں سبب بتانا پڑتا اور یہی اُسے منظور نہیں تھا چنانچہ اس کتے کی طرح جو چاہتا ہو کہ اس کا مالک تیز چلے اور جو اپنی بے زبانی پر دل ہی دل میں کڑھ رہا ہو وہ بہت تیزی سے چل کر بڑے بابو سے دس قدم آگے نکل جاتا، پھر دفعتاً رُک جاتا اور بڑے بابو کا انتظار کرتا اور پھر اسی طرح تیز چلنے لگتا۔

باوجود اس کے کہ وہ یہ بدنما حرکت بار بار کر رہا تھا بڑے بابو اسی دھیمی چال سے چلتے رہے۔ انھوں نے اتنا بھی نہیں پوچھا کہ تم یہ کیا تماشا کر رہے ہو۔

خدا خدا کر کے دونوں اسٹیشن پر پہنچے۔ ٹکٹ بابو جھپٹ کر ٹکٹ گھر میں گیا اور اس نے فوراً وہ چھوٹی سی کھڑکی کھولی جس میں سے وہ کسانوں کو ٹکٹ دیا کرتا تھا۔ حالانکہ کوئی مسافر موجود نہ تھا اور وہ خوب جانتا تھا کہ کسان اگر گاڑی کے وقت سے چند گھنٹے پہلے نہ پہنچ جائیں تو پھر وہ نہیں آتے، لیکن اسے اپنے ٹکٹ گھر سے بہت محبت تھی۔ وہاں بیٹھ کر وہ اپنے وسیع اختیارات کا لطف اٹھاتا تھا جنھیں وہ اس طرح

استعمال کرتا تھا کہ کسی کو ٹکٹ دیا کسی کو نہ دیا اور جس سے چاہا خوشامد کرائی۔ وہاں اُسے یہ احساس ہوتا تھا کہ کسان اس سے مرتبے میں بدرجہا کم ہیں اور ان سے گفتگو اور برتاؤ کا طریقہ محض اس کی مرضی پر موقوف ہے۔ یہ نہیں تھا کہ وہ کسانوں سے من مانے دام وصول کرے بلکہ عموماً کسان اس سے کرایے میں رعایت کی درخواست کرتے تھے اور وہ انھیں جھڑک کر مقررہ کرایے سے زائد وصول کرنے کی دھمکی دیتا تھا، مگر آخر میں بڑا احسان جتا کر ٹھیک دام پر ٹکٹ دیتا تھا۔ اگر کوئی کسان اپنے لڑکے یا لڑکی کے لیے جس پر بلوغ قانونی کا شبہ ہو سکے آدھا ٹکٹ مانگتا تھا تو وہ نہایت خشونت سے اور اس سراغ رس کا منہ بنا کر جو کسی مشتبہ آدمی سے جرح کرتا ہے، اس لڑکے یا لڑکی کو اپنی کھڑکی کے پاس بلاتا، اُس کے دانت اور زبان کا معائنہ کرتا اور بہت سے سوال پوچھتا تھا جو اس نے خود بنا کر رکھے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ان سوالات سے اس لڑکے یا لڑکی کی سمجھ کا اندازہ کر کے نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اس کی عمر کیا ہے۔ عموماً اگر ذرا بھی موقع ہوتا تو وہ یہ فیصلہ کرتا تھا کہ پورا ٹکٹ خریدنا چاہیے، کسان کو اس کی بے وقوفی اور بیچڑپن پر ڈانٹتا تھا اور دھمکاتا تھا کہ وہ اُسے کارکنان ریلوے کو دھوکا دینے کے الزام میں پولیس کے سپرد کر دے گا، مگر آخر میں یہ کہہ کر آدھا ٹکٹ دے دیتا تھا کہ پھر کبھی نہ دوں گا۔ وہ ہمیشہ سمجھتا تھا کہ اس کا ضمیر اسے اس طرز عمل پر مجبور کرتا ہے۔ اس کے نزدیک کسانوں کو دھمکانا اور گالی دینا ضروری تھا، ورنہ بقول اس کے "خدا جانے کیا ہو جائے؟"

وہ کچھ دیر تک ٹکٹ گھر میں بیٹھا اپنے حسابات دیکھتا رہا۔ اس کے بعد خیال کر کے کہ اب اسے اپنے اختیارات کے استعمال کرنے کا موقع نہیں ملے گا اُس

نے ٹکٹ گھر کو بند کر دیا۔ پلیٹ فارم پر بڑے بابو ٹہل رہے تھے۔ وہ اب تک محویت کے عالم میں اس پیغام پر غور کر رہے تھے جو انھیں آم کے کنج کی زبانی ملا تھا۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ ابھی تک کنج میں ہیں، وہ کان لگا کر اور دل لگا کر اس پیام امن کو سننا چاہتے تھے اور اپنی روح کو اس کی موسیقی سے پُر کرنا چاہتے تھے، تاکہ وہ دنیا میں آم کے کنج کی طرح کسی کے لئے برکت، کسی کے لئے نعمتِ عظمیٰ ہو جائیں اور ان لوگوں کے سامنے جو ان اسرار سے واقف نہ ہوں، متانت اور وقار کا مجسمہ بن کر رہیں۔ شام کی تاریکی سے انھیں کوئی الجھن نہ تھی، یہ سوچ کر بھی نہیں کہ اب کنج ان کی نظر سے چھپ جائیں گے۔ آج شام کو ان کنجوں میں ایک نئی شان پیدا ہو گئی تھی۔ اسٹیشن ماسٹر کے دل پر ان کا اثر بھی نئی طرح کا تھا۔ یہ اب درختوں کے کنج نہیں تھے بلکہ ایک فلسفیانہ تصور بن گئے تھے، یہ اب اشیا نہیں تھے جن کا خیال کیا جائے بلکہ خود خیالات تھے، اس قابل کہ آدمی ان سے لطف اٹھائے، ان میں محو ہو کر سو جائے، اپنے آپ کو زندگی کے عظیم الشان سمندر میں ایک قطرہ سمجھے اور اس کی بے پایاں وسعت میں گم ہو جائے۔

ٹکٹ بابو نے دور سے دھواں دیکھا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سنبھل کر کھڑا ہو گیا تاکہ مسافروں سے ٹکٹ لے لیکن بڑے بابو اب تک اس اطمینان سے ٹہل رہے تھے گویا کوئی گاڑی وہاں نہیں آرہی ہے اور وہ ہر قسم کے فرائض و افکار سے بے تعلق ہیں۔ جب گاڑی پہنچ گئی تو وہ آہستہ آہستہ اپنے آفس میں گئے اور وہاں سے لائن کلیر اور سبز جھنڈی لے آئے۔ لیکن آج وہ اپنے خیالات میں اس قدر محو تھے کہ وہ اپنے معمول کے مطابق ڈرائیور سے مسکرا کر پوچھنا بھول گئے کہ تمھارا

انجن اگلے اسٹیشن تک کام دے جائے گا یا نہیں، اور جب گاڑی چھوٹنے کا وقت آیا تو انھوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا بلکہ صرف سبز جھنڈی ہلا دی۔

گاڑی سے صرف ایک مسافر اُترا۔ ٹکٹ بابو دروازے پر انتظار کرتا رہا۔ جب وہ نہ آیا تو پلیٹ فارم کی طرف لپکا۔ وہ اس پر بہت اصرار کرتا تھا کہ کسان ٹکٹ پلیٹ فارم پر نہیں بلکہ مقررہ جگہ پر دیں، حالانکہ انھیں آسانی پلیٹ فارم پر ہی دینے میں ہوتی تھی، کیونکہ ان کو متعدد گٹھریاں کھول کر ٹکٹ نکان پڑتا تھا۔ ٹکٹ بابو شاید اس ارادے سے آیا تھا کہ مسافر کو خلاف ورزی قانون بطور مزاحمت بکار سرکار کے جرم میں خوب ڈانٹے ڈپٹے اور اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ٹکٹ نکالنے کا تماشا دیکھے لیکن اسے خلاف توقع ایک عجیب منظر دکھائی دیا۔

اس نے ایک تنومند کسان کو دیکھا جس کے ہاتھ میں بڑی سی لاٹھی تھی اور جو کھڑا ہوا غضب آلود نظروں سے ہر طرف دیکھ رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر بڑے بابو کھڑے تھے اور خاموش ملامت کے انداز سے کسان کو دیکھ رہے تھے۔ کسان نے ٹکٹ بابو کو دیکھ کر گرج کر کہا :-

"کون سار ہم سے ٹکٹ مانگ سکت ہے ؟"

ٹکٹ بابو اس طرح کھڑا رہ گیا جیسے کسی نے اس کے پیر پکڑ لئے ہوں اور خوف کے مارے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ کسان نے پھر اُسی لہجے میں لاٹھی پلیٹ فارم پر ٹیک کر کہا :-

"ہم سے کوئی سار ٹکٹ ناہیں مانگ سکت ہے۔"

ٹکٹ بابو رفو چکر ہو چکا تھا اس لئے اب وہ بڑے بابو کی طرف مخاطب ہوا۔

بڑے بابو نے جن پر ذرا بھی خوف طاری نہ تھا چپکے سے پوچھا "کیا تمھارے پاس ٹکٹ نہیں ہے؟" کسان نے ایک قدم بڑھ کر اور لاٹھی ہلا کر کہا:۔

"کا تم ٹکٹ منگیہو؟"

ٹکٹ بابو اپنے سونے کے کمرے کی کھڑکی سے جھانک رہا تھا۔ وہ چاہتا ہی تھا کہ دہائی مچانا شروع کرے لیکن اسے خیال آگیا کہ کسان کو اس کی جائے پناہ معلوم ہو جائے گی اور وہ بھی قتل عام میں مارا جائے گا۔ بڑے بابو اور کسان چند لمحے تک خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے اور بڑے بابو نے جواب تک خوف زدہ نہ تھے کہا:۔

"بھائی اگر تمھارے پاس ٹکٹ ہے تو دے دو نہیں اپنا رستہ لو۔ بھگوان تمھارا بھلا کرے۔ مگر اس قدر لال پیلا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

کسان نے پھر بد تمیزی کے ساتھ کہا:۔

"چلے میں ہم سے ٹکٹ مانگے؟"

اس کے بعد وہ دروازے کی طرف مڑا اور نکل کر اکڑتا ہوا چلا گیا۔ بڑے بابو پھر ٹہلنے لگے جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی اور پھر آم کے کنج کے خیال میں غرق ہو گئے۔

کچھ دیر بعد ٹکٹ بابو اپنے سونے کے کمرے سے ڈرتا ڈرتا نکلا جیسے اسے ہر لمحہ لاٹھی پڑنے کا خوف ہو اور سگنل والے کی کوٹھڑی کی طرف چلا۔ سگنل والا بھی اسی طرح احتیاط کے ساتھ ٹکٹ بابو کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ دونوں میں پلیٹ فارم پر مڈبھیڑ ہو گئی۔

ٹکٹ بابو نے آہستہ سے پوچھا "تم نے اسے دیکھا تھا؟" سگنل والے نے

کہا "ہاں"۔ ٹکٹ بابو نے کہا "بڑا غضب ہوا، اب وہ جاکر دوسرے کسانوں سے کہے گا اور سب لاٹھی باندھ کر آئیں گے اور ہمیں مار ڈالیں گے۔ میرے خیال میں ہمیں فوراً پولیس کو اطلاع کرنا چاہیے۔"

سگنل والا بولا "ہاں رپورٹ فوراً کرنا چاہیے مگر کون تھانے میں جائیں۔ یہ جو گانوں میں ہے اس میں تو میں کبھی نہیں جاؤں گا۔ ہاں ریل کے کنارے کسی تھانے میں کہیے تو چلا جاؤں۔"

ٹکٹ بابو نے کہا "ہاں میری بھی یہی رائے ہے اور میں بڑے بابو سے سپرنٹنڈنٹ پولیس کے نام یہ رپورٹ ضرور بھجواؤں گا کہ ہمارا علاقہ خطرناک ہو گیا ہے اور ہماری جانیں محفوظ نہیں۔"

بڑے بابو ٹہلتے ہوئے ان دونوں کے پاس سے گزر رہے تھے، مگر انھوں نے ان کو نہیں دیکھا کیونکہ رات ہو گئی تھی، دوسرے وہ اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے تھے۔ دیر تک یہ دونوں خاموش اور بے حس و حرکت کھڑے رہے اور اسٹیشن ماسٹر کو ٹہلتے ہوئے دیکھتے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ان کی آواز آئی "بابو، بابو، آؤ۔ نکل آؤ اب کوئی خطرہ نہیں۔" وہ سمجھے تھے کہ ٹکٹ بابو اب تک اپنے گھر میں ہے۔

سگنل والے نے بابو کو ٹھوکا دے کر کہا "جائیے آپ کو بڑے بابو بلا رہے ہیں۔ میں اپنے سگنل پر جاتا ہوں اور آپ بڑے بابو سے کہہ دیجیے کہ ایک چوکیدار رکھ لیں۔ میری جان فالتو نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر سگنل والا لمبا ہوا اور ٹکٹ بابو کو وہیں کھڑا چھوڑ گیا۔ ٹکٹ بابو کو اب

سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اس مقام کی طرف بڑھے جہاں اُسے اندھیرے میں بڑے بابو کے سفید کپڑے نظر آرہے تھے۔

اس نے بہت آہستہ سے کہا "کیا آپ نے مجھے پکارا تھا؟" وہ بڑے بابو کے پاس جاتے ہوئے ڈرتا تھا گویا ان میں اسے خوں خوار کسان کی جھلک نظر آتی تھی۔

بڑے بابو نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا:۔

"ہاں میں نے پکارا تھا۔ آؤ دیکھو کیسی پیاری رات ہے۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ دم بھر میں چاند کہیں سے نکل آئے گا۔ دیکھو ایک جگہ ہے جہاں تاریکی سب سے زیادہ گہری ہے۔ یہی وہ کنج ہے جہاں ہم تھوڑی دیر ہوئی بیٹھے تھے۔ کہو پھر چلتے ہو؟"

ٹکٹ بابو جانے کے خیال سے کانپ گیا۔ اس نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا "جی نہیں۔" کچھ دیر ٹھہر کر اس نے پھر کہا:۔

"ہاں تو بتائیے، آپ اس کسان کے معاملے میں کیا کریں گے۔ بہت سخت کارروائی کی ضرورت ہے۔"

بڑے بابو نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "میں کیا سخت کارروائی کروں۔ جب میرے اردگرد ہر چیز پر امن و امان خاموشی اور سنجیدگی چھائی ہوئی ہے۔"

ٹکٹ بابو نے نہایت حیرت کے ساتھ کہا:۔

"آپ کچھ نہیں کریں گے، مگر یہ تو سوچئے کہ سب کسان لاٹھی باندھ کر آیا کریں گے اور ہم ان سے ٹکٹ مانگیں گے تو ہمیں مار ڈالیں گے۔"

بڑے بابو نے کہا:۔

"نہیں وہ ایسا نہیں کریں گے۔"

ٹکٹ بابو نے گھبرا کر پوچھا:۔

"آپ کیسے کہتے ہیں کہ وہ نہیں کریں گے؟"

"کیونکہ مجھے معلوم ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں جس شخص نے آج بدتمیزی کی وہ "باغی" تھا۔ وہ سب لوگوں کی طرح نہیں تھا۔ دوسرے کسان جہاں تک اُن سے ہوسکتا ہے سارے قوانین کی پابندی کرتے ہیں۔ وہ کھیتوں میں کام کرتے ہیں اور فطرت کی ہم آہنگی کے اثر سے وہ بھی امن پسند ہو جاتے ہیں۔"

"اور جو وہ سب باغی ہو جائیں؟"

بڑے بابو پر دفعتہً یاس کا غلبہ ہوگیا اور وہ کہنے لگے:۔

"باسو، معلوم ہوتا ہے تم خود باغی ہو ورنہ ایسی باتیں نہ کرتے۔ تم عالم فطرت کو جو تمھارے گرد ہے ذرا بھی نہیں سمجھ سکتے۔ ورنہ تم ایسے خیالات نہ رکھتے۔ مجھے دیکھو، میں چالیس برس کا ہوگیا مگر میں ہر جگہ ہر وقت بے دھڑک جاسکتا ہوں۔ تم جوان آدمی ہو مگر ڈرا کرتے ہو کہ لوگ بس تمھیں مارنے کے لئے منتظر ہی بیٹھے ہیں نہیں بھائی، تم بھی باغی ہو، تم بھی نہیں سمجھتے۔ آج شام والے کسان کی طرح تم بھی یہی خیال کرتے ہو کہ ہر چیز دنیا میں تمھاری مخالفت پر تلی ہوئی ہے۔ تو تم بھی لاٹھی باندھا کرو نہ۔"

ٹکٹ بابو نے کچھ جواب نہیں دیا کیونکہ وہ بات سمجھا ہی نہیں تھا۔ لیکن اگر اُس میں ہمت ہوتی تو وہ اس پر بہت خفا ہوتا کہ بڑے بابو نے اُسے باغی کہا اور ایک معمولی کسان اور مجرم سے اس کا مقابلہ کیا۔ وہ چپ چاپ بڑے بابو کے پاس کھڑا رہا اور اُسے بڑا سہارا یہ تھا کہ اندھیرا ہے۔ اس وقت کوئی حملہ کرنے نہ آئے گا۔

بڑے بابو نے کہا "اور میں کر ہی کیا سکتا ہوں۔ اگر میں پولیس کو اطلاع کرتا ہوں

تو وہ کسی بے گناہ کو پکڑ کے اس پر جرمانہ کر دے گی۔ یہ پولیس والے بھی نہیں سمجھتے۔ کسان اکٹھا ہو کر بلا ٹکٹ سفر کرنے نہیں آئیں گے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو پولیس ان کا چالان کر دے گی۔ تمھیں ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔"

ٹکٹ بابو نے بہت زور دے کر کہا "میں ڈرتا نہیں ہوں صرف سردی کے سبب سے کانپ رہا ہوں۔ آپ جانتے ہیں اب سردی پڑنے لگی ہے۔ مگر سنئے بڑے بابو! آپ کو کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے ورنہ کسانوں کی نظر میں ہماری بڑی بدرعبی ہوگی اور خدا جانے کیا ہو جائے گا۔"

"میں اس وقت جو کچھ کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ تم کو گھر پہنچا دوں۔ اب کوئی کام نہیں۔ اس لئے ہمیں اب آرام کرنا چاہیے۔"

دونوں گھر چلے گئے۔

ٹکٹ بابو کو بہت دن تک خواب میں خوں خوار کسان نظر آتے تھے اور نیند آنا دشوار تھا اور جب کبھی اسے دفعۃً اس شام کا حادثہ یاد آتا تھا، وہ جھپٹ کر بڑے بابو کے پاس جاتا تھا اور ان سے منت سماجت سے کہتا تھا کہ وہ شدید تدابیر اختیار کریں اور کسانوں کے ساتھ سختی سے پیش آئیں۔

چراغِ راہ

ہمارا قصبہ تو ایک چھوٹی سی جگہ تھی، اگر کوئی بڑا شہر ہوتا تب بھی محفوظ علی صاحب کی ہستی اتنی ہی مشہور اور رہ نمائی میں اتنی ہی کامیاب ہوتی۔ وہ امیر نہیں تھے، امیدواروں کی سفارشیں نہیں کر سکتے تھے، زیادہ ملنسار بھی نہیں تھے اور جان پہچان والوں کو ان کی صحبت میں کوئی خاص لطف بھی نہیں آتا تھا۔ یہ خصوصیات ان لوگوں میں پائی جاتی ہیں جنھیں قسمت نے اپنی اصل نعمتوں سے محروم رکھا ہے۔ محفوظ علی صاحب کو قسمت نے دولت اور اقتدار کی بجائے ایک فن میں کمال حاصل کرنے کا مادہ عطا کیا تھا۔ دیس بدیس میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو ان سے برابری کا دعویٰ کر سکے، اس لیے ان کا رتبہ امیروں اور با اثر لوگوں سے بہت بلند تھا، کیونکہ دولت اور اقتدار کی نعمت تو چھوٹے بڑے حصوں میں ہزارہا آرزومندوں کو ملی ہے اور محفوظ علی صاحب اپنے فن میں یکتا تھے۔ وہ محض صاحبِ کمال نہیں تھے بلکہ اپنے فن کے موجد بھی، اور یہ ان کے تصور کی رسائی، احساس کی نزاکت اور مذاق کی خوبی کی ایسی زبردست دلیل تھی کہ ہر شخص ان کی عظمت کے سامنے سر جھکانے پر مجبور تھا۔ ان کا قول تھا جسے سب بلا تامل تسلیم کرتے تھے کہ بغیر ایثار کے کسی فن میں کمال حاصل نہیں ہو سکتا، اور انھوں نے اپنی زندگی، اپنے قویٰ، اپنے سارے حوصلے

اپنے فن کی نذر کر دئے تھے لیکن ایثار کی صلاحیت بھی کچھ خون میں ہوا کرتی ہے اور دوسری خاندانی املاک کی طرح باپ سے بیٹے کو ملتی ہے. محفوظ علی صاحب کے دادا محمود علی نے طوائفوں اور گویوں پر لاکھوں روپیہ صرف کر ڈالا تھا. مرتے وقت تک ان کے گھر میں فاقے کی نوبت آ چکی تھی مگر انھیں اس کا افسوس تھا کہ افلاس کی وجہ سے وہ ایک رنڈی کی قدر دانی نہ کر سکے جو حسن میں اور خوش آوازی میں تمام ہم پیشہ عورتوں اور مردوں سے بازی لے گئی تھی. محفوظ علی صاحب کے والد مقصود علی صاحب کو عورتوں اور موسیقی سے دلچسپی نہیں تھی. ان کے خیال میں صاحب فن کا اپنے جوہر دکھانے کے لئے کسی دوسرے کا محتاج ہونا خامی کی دلیل تھی. انھوں نے منشی اشیاء کے استعمال میں مہارت حاصل کی اور اس پر تمام دنیاوی حوصلے اور سب سے زیادہ تندرستی نثار کی اور اس فن میں حیرت انگیز کرشمے دکھائے. وہ ٹھرا جس کا ایک گھونٹ پست حوصلہ آدمیوں کو لٹا دیتا، مقصود علی صاحب گھڑوں پی جاتے. وہ بھنگ اور چرس جس کا ایک کش دوسروں کے ہوش اڑا لے جاتا، وہ سیروں پھونک ڈالتے. عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا اہل ہنر کو رسوا کرتی ہے، ان کی آرزوؤں کا منہ چڑھاتی ہے لیکن مقصود علی صاحب کا تجربہ اس کے بالکل برعکس تھا. ان کے کمال کی شہرت دور دور پھیل گئی. ہر رئیس اپنا فخر سمجھتا تھا کہ انھیں شادی بیاہ اور خوشی کے موقعوں پر بلائے اور اپنے مہمانوں کو ان کے کرتب دکھلائے. انھوں نے ساری عمر حیرت اور تعریف کا خراج وصول کرنے میں گذاری. زمانے کی ناقدردانی سے انھیں صرف ایک بار شکایت ہوئی، جب کسی نااہل باپ نے خدا جانے کس بنا پر

ان سے اپنی لڑکی کی شادی کرنے سے انکار کر دیا مقصود علی صاحب بعد کو جب کبھی اس پر غور کرتے تو اس انکار کی صرف ایک وجہ ان کی سمجھ میں آتی، اور وہ یہ کہ اس زمانے میں ان کی عمر چھبیس سال کی تھی اور انھیں اپنے فن میں وہ کمال نہیں حاصل ہوا تھا جس نے آگے چل کر انھیں رشک جہاں بنا دیا۔

دنیا کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے۔ مقصود علی صاحب کے انتقال کے کچھ دنوں بعد ہی لوگ شراب خوری کی مجلسوں میں ان کا نام لینا اور ان کے کارناموں کی داستانیں سنانا بھول گئے، اسی طرح جیسے طوائفیں محمود علی صاحب کی قدردانی اور خوش مذاقی بھول گئی تھیں۔ باپ اور دادا کی یادگار زندہ کرنے کا فرض محفوظ علی صاحب نے ادا کیا۔ جب کبھی ان کی تعریف کی جاتی تو وہ نہایت درجہ سعادت مندی سے اپنے بزرگوں کا ذکر چھیڑ دیتے اور بجائے اس کے کہ مٹھائی پر فاتحہ کرا کے غریبوں میں تقسیم کرائیں وہ اس تعریف کا ایک قصہ خدا کے یہاں لکھوا دیتے، حالانکہ انھیں یقین تھا کہ ان کے بزرگوں کو دعائے خیر کی حاجت نہیں۔ ان کا پختہ عقیدہ تھا کہ ایک ایسے شخص کا رتبہ جو اپنے فن پر جان نثار کر دے اس جواں مرد سے کم نہیں جو میدان جنگ میں اپنی جان ملت پر قربان کرے۔ دونوں اپنی اپنی طرح پر شہید ہوتے ہیں۔ ان کے رتبوں میں اونچے نیچے کا فرق کرنا انتہائی گستاخی ہے۔

خود محفوظ علی صاحب کے کمال کا ذکر آتا ہے تو میرا قلم رک رک جاتا ہے اور میری خامیاں مجھے سہما دیتی ہیں۔ میں ہرگز اس لائق نہیں کہ ایسے نازک مسئلے کو اپنا موزوں بناؤں۔ میرے قلم میں یہ قدرت کہاں کہ ایسے باریک نقش اتار سکے

جو محفوظ علی صاحب کی صورت گری کے لئے درکار ہیں ۔ میں اپنی تحریر میں وہ نیرنگیاں، وہ شوخی، وہ تیزی اور طراری کیسے پیدا کر سکتا ہوں جو محفوظ علی صاحب کی تقریر کو سنوارتی تھی لیکن جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے " دنیا کا حافظہ بہت کمزور ہے " میں ڈرتا ہوں کہ کہیں محفوظ علی صاحب کی یادگار بالکل بھلا نہ دی جائے ۔ میں اپنی خامیوں کو محسوس کرتا ہوں ۔ مجھے افسوس ہے کہ محفوظ علی صاحب کی یادگار زندہ رکھنے کے لئے میری لنگڑی لولی تحریر کے سوا کوئی ذریعہ نہیں اور اس داستان کے پڑھنے والوں سے میری التجا ہے کہ وہ میری کوتاہی محفوظ علی صاحب کی طرف منسوب نہ کریں ۔ میری دشواریوں کا لحاظ کر کے میرے اوپر رحم کریں اور اپنے تصور سے اس تصور کو روشن کر لیں جو مجھے اندیشہ ہے کہ باوجود میری کوششوں کے دھندلی رہ گئی ہے ۔

محفوظ علی صاحب کا فن آموں کا کھانا اور کھلانا تھا ۔ یوں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں معلوم ہوتی ۔ ہر کس و ناکس جس کی گرہ میں کافی دام ہوں آم خرید کر کھا اور کھلا سکتا ہے ۔ محفوظ علی صاحب کا کمال اسی میں تھا کہ انھوں نے اس معمولی سی بات کو فن کے درجے تک پہنچایا اور اسی طرح جیسے بڑے شاعر روزمرہ کہہ کر زبان پر قادر ہونے کا انتہائی ثبوت دیتے ہیں ، محفوظ علی صاحب چند احباب کو آموں کی دعوت دے کر ثابت کر دیتے کہ جس شخص کو خدا نے احساس اور مذاق عطا کیا ہو وہ اس معمولی سی بات میں کیا کیا کیفیتیں پیدا کر سکتا ہے ان کے دادا شہوت کو عطر میں بساتے تھے ، نفس کی بھوک کو نعمتوں سے اور حسن کے نظارے سے تیز کرتے تھے اور ایک خواہش جو فطرتاً ہر شخص میں ہوتی ہے اس

اہتمام سے پوری کرتے تھے کہ پارساؤں کو ان پر رشک آتا اور بوالہوسوں کو عبرت ہوتی۔ یہ عظمت انھیں ان کے کمال ایثار نے بہم پہنچائی اور یہی ایثار محفوظ علی صاحب کے والد مقصود علی صاحب کی شہرت اور ہر دل عزیزی کی بنیاد تھا وہ ٹھرّے کے گلاس چڑھا کر دوسروں کی طرح نشے سے چور نہیں ہو جاتے تھے شراب ان کی رگوں میں دوڑتی پھرتی تھی۔ شراب کے تصور میں ہر وقت وہ اس طرح بے خود رہتے تھے کہ نشہ ان کی محویت میں صرف حقیقت کی شان پیدا کر دیتا تھا۔ یوں ہی محفوظ علی صاحب کے لئے آم کھانا محض ایک لذیذ شے سے پیٹ بھرنا نہیں تھا، ان کی ہستی آموں کی رنگت اور بو اور مزے میں گم ہو گئی تھی۔ جب تک درختوں پر بور نظر نہ آتا تھا، ان کی طبیعت نڈھال رہتی۔ ان پر وہ ساری مصیبتیں گزر جاتیں جو سچے عاشق پر ہجر کے زمانے میں گذرتی ہیں، ان کے مایوس چہرے اور برداشتہ خاطر اور بے پروا نگاہوں سے ہر شخص پر ظاہر ہو جاتا تھا کہ بس وہ ایک وعدے پر جی رہے ہیں۔ فروری اور مارچ کے مہینوں میں جب بور پھوٹ کر ٹہنیوں سے نکلنا شروع ہوتا تو محفوظ علی صاحب کا شگفتہ چہرہ، تیز رفتار، گرم گفتار اور مستی سے ناچتی ہوئی نگاہیں دیکھ کر یقین نہ آتا کہ یہ وہی بزرگ ہیں جو کچھ دن پہلے بوڑھوں کی طرح کمر جھکائے خلق خدا کی ہمدردانہ نظروں کے سہارے لڑکھڑا لڑکھڑا کر کہیں چل پھر پاتے تھے اور ایسے اداس تھے کہ منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ اپریل اور مئی محفوظ علی صاحب کے لئے بڑی بے چینی کے مہینے تھے۔ یہ وہ مہینے ہیں جب موسم کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، بے رحم آندھیوں سے باغ کے باغ برباد ہو جاتے ہیں، بے وقت بارش

فصل کی فصل کا مزہ پھیکا کر دیتی ہے۔ ان مہینوں میں محفوظ علی صاحب دن رات اضطراب میں تڑپ تڑپ کر گزارتے تھے کبھی ایمان اور توکل سے امیدوں کو جگاتے اور جلاتے، کبھی کفر کے کلموں سے دل پر نشتر لگاتے لیکن وہ دن کبھی نہ کبھی آ ہی جاتے جب آم نشو و نما کے تمام مرحلے طے کر کے رس پر آجاتے اور مہینوں کی کلفتوں کے بعد محفوظ علی صاحب کو زندگی کا مزہ آنے لگتا۔

مجھے اکثر ان خوش نصیب ہستیوں کے زمرے میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے جنھیں قصبے کی آبادی سے چن چن کر محفوظ علی صاحب اپنی مجلسوں میں بلاتے تھے۔ میں اپنی عمر کے اکثر واقعات بھول گیا ہوں لیکن ان مجلسوں کی تصویر کے نقش میرے دل پر ایسے گہرے ہیں کہ انھیں شاید موت بھی نہ مٹا سکے۔ دعوتیں عموماً شام کو ہوا کرتی تھیں۔ صحن میں تخت پر آموں کی لگن دیکھ کر تمام احباب واہ واہ، جزاک اللہ، سبحان اللہ کے نعرے بھرتے ہوئے خود بخود لگن کے چاروں طرف جمع ہو جاتے۔ ان کی نگاہیں آموں پر اسی طرح جم جاتیں جیسے پروانوں کی شمع پر اور جب محفوظ علی صاحب یہ دیکھ لیتے کہ آموں کے نظارے نے اشتیاق کو انتہا تک پہنچا دیا ہے اور اہل ذوق کے دل مرغ اسیر کی طرح تمناؤں سے تڑپنے لگے ہیں تو وہ مسکرا کر لگن کے پاس اپنی مخصوص جگہ پر رونق افروز ہوتے اور ان کے ہاتھ میں چھری چمکنے لگتی۔ لیکن وہ آموں کے ایسے قدر داں تھے، کہ وہ اس اشتیاق کو جو محض نظارے سے پیدا ہوتا ہے کافی نہ سمجھتے تھے۔ اپنے احباب کی بے تابی اور اشتہا کو دوبالا کرنے کے لئے وہ ایک ایک کر کے آموں کو اٹھاتے، ان کے نام بتاتے اور ان کے

رنگ اور خوشبو کی تعریف میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے۔ جب ادا شناسی کا حق ادا ہو جاتا تو وہ یہ سوال پیش کرتے کہ کس آم سے بسم اللہ کی جائے اور اس مشکل مسئلے پر کل احباب کی رائے لی جاتی۔ اسی سلسلے میں ایک نہایت دلچسپ بحث چھڑ جاتی اور جیسے کسی زمانے میں شاگرد شعرا دوسروں پر فضیلت جتانے کے لئے اپنے استادوں کی خوبیاں بیان کرتے تھے ویسے ہی محفوظ علی صاحب کے احباب میں سے ہر ایک کوشش کرتا کہ اپنے محبوب آم کی خصوصیات واضح کرے اور اس کی تعریف اس انداز سے کرے کہ اس سے بڑھ کر تعریف کرنے کی گنجائش ہی نہ رہے۔ اس بحث میں بلاغت کی جو شعبدے بازیاں دکھائی جاتیں اور زبان دانی و حاضر جوابی کے جو معجزے پیش کئے جاتے انھیں ضبط تحریر میں لانا اس حقیر کے امکان سے باہر ہے لیکن اتنا ہر شخص محسوس کر سکتا تھا کہ اس مباحثے اور مناظرے میں چٹ پٹا پن محفوظ علی صاحب کے فقرے پیدا کرتے تھے اور سچ پوچھئے تو وہ زبان جو یہاں بولی جاتی تھی اس کی لغت اور اصطلاحات ساری محفوظ علی صاحب ہی نے وضع کی تھیں۔ وہ اپنے دوستوں کی دلیلیں بڑے شوق سے سنتے تھے، بڑی نکتہ بینی سے ان کو جانچتے، داد دیتے اور انصاف کرتے لیکن دراصل وہ اپنے جوہر اس وقت دکھاتے تھے جب کل احباب یک زبان ہو کر کہتے کہ ایسے نازک معاملے میں مباحثے سے تصفیہ نہیں ہو سکتا اور ہر شخص فرمائش کرتا کہ اس کا پسندیدہ آم محفوظ علی صاحب کھلا کر اس کی رائے کو صحیح ثابت کر دیں۔ تب وہ نہایت پیار سے ایک آم اٹھاتے، اسے ہاتھ میں اچھالتے۔ اسے سونگھ کر اس کی خوشبو سے مست ہو جاتے، جھوم کر واہ واہ کی صدا بلند کرتے اور

اپنی نیم باز آنکھوں سے احباب پر ایک شفقت بھری نظر ڈال کر انتہائی نفاست اور صفائی سے ایک قتلہ کاٹتے اور اس خاص آم کے سب سے زیادہ چرب زبان شیدائی کو کھلاتے۔ اسے استادوں کے مشاعرے کی پہلی غزل سمجھئے یا مجلس رقص وسرود میں کسی پری پیکر رقاصہ کے نازک پھول جیسے پاؤں کی پہلی جنبش، اس کے گھونگرو کی جھنکار۔ محفوظ علی صاحب کا قتلے تقسیم کرنا گویا ساغر کو دور میں لانا تھا محفل پر مستی چھا جاتی تھی، ہر ایک جھومنے لگتا تھا اور اس کی زباں حیرت انگیز سہولت سے اس کے جذبات پنہاں کی ترجمانی کرنے لگتی تھی۔ محفوظ علی صاحب کبھی اپنی تقریر سے شراب کا نشہ بڑھاتے اور ساتھ ہی اپنے فقروں کو گزک کے طور پر پیش کرتے۔ کبھی جذبات سے ان کی آنکھیں بجلی کی طرح اس فضا میں چمک جاتیں۔ اسے منور کر دیتیں اور رندوں کی نگاہوں میں چکا چوندھ ڈال دیتیں۔ جب آخر کار آم سب ختم ہو جاتے اور لگن کے پانی میں ہمارا عکس ہمارا منہ چڑھانے لگتا، تو محفوظ علی صاحب ایک سرد آہ بھرتے اور کسی برمحل شعر سے اہل مجلس کو دنیا کی عیاری، اور عمر کی بے ثباتی اور موسم گل کی ناپائداری سے آگاہ کر کے ان کے سر سے نشہ اتار دیتے لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہمیں محفوظ علی صاحب کے وعدے زندہ رکھتے تھے، ورنہ خدا جانے ہم پر کیا گزرتی۔ خود محفوظ علی صاحب کی کیفیت سب سے زیادہ دردناک تھی، ان کے گال لٹک آتے، آنکھوں کی روشنی بجھ جاتی، بات کرتے تو معلوم ہوتا کہ ان کا گلا گھٹ رہا ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اگر ہم یاد رکھیں کہ انھوں نے آموں پر کیسی کیسی نعمتیں قربان کی تھیں اور آموں کے کھانے اور کھلانے کے فن میں کمال حاصل کرنے کی غرض سے انھوں

نے کس یکسوئی اور استقلال سے اپنے ذہنی قویٰ اس مبارک کام کے لئے وقف کر دیئے تھے تاکہ دوسرے عزت اور شہرت کے امیدوار سبق لے سکیں اور کوئی ایسی غلط فہمی نہ پیدا ہو جو ان کی عظمت میں فرق ڈال سکے۔ میں اختصار کے ساتھ ان کی زندگی کے حالات لکھنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

محفوظ علی صاحب کے والد صاحب فن کی لوازمات کیسے پوری کر سکتے تھے اگر وہ اولاد کی تربیت میں اپنا وقت صرف کرتے۔ ان کے توکل کا نتیجہ یہ ہوا کہ محفوظ علی صاحب کو ان کی ایک دور کی رشتے دار نے جو خاصی خوش حال تھیں متبنیٰ کر لیا۔ محفوظ علی صاحب کی ذہانت نے استادوں کا کام بہت آسان کر دیا اور اُنھوں نے اسکول اور کالج کے تمام امتحانات بہت کامیابی سے پاس کر لئے۔ کالج میں انھوں نے اپنا سکہ ایسا جمایا کہ فارغ التحصیل ہوتے ہی انھیں ایک اچھی نوکری مل گئی جس میں ترقی کی بہت گنجائش تھی، اور عہدے پر مامور ہوتے ہی ان کی شادی بھی ہو گئی۔ ان کی بیوی حسن اور سلیقے میں یکتا تھیں اور انھیں اپنے شوہر سے وہ گہری اور سچی محبت بھی ہو گئی تھی جو صرف اہل دل کا حصہ ہے لیکن دنیا داروں کے گر کچھ اور ہی ہوتے ہیں، اہل فن کے کمالات کچھ اور۔ محفوظ علی صاحب نے بہت جلد معلوم کر لیا کہ وہ دنیا داری کے لئے موزوں نہیں ہیں اور اگر انھوں نے اپنی قابلیت اور ذہانت کے بوتے پر کامیابی حاصل بھی کر لی تو اس روحانی تسلی سے محروم رہیں گے جو انسانی مسرت کا جوہر ہے۔ پچیس سال کی عمر میں ان کے ضمیر نے انھیں وہ راستہ بھی سمجھا دیا جس کے سوا منزل مقصود تک پہنچنے کا ان کے لئے کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔

آموں کا تو انھیں پیدائشی شوق تھا اور انھوں نے دور دور سے قلمیں منگوا کر ایک اچھا خاصا باغ لگا لیا تھا، مگر بہت ممکن تھا کہ وہ دنیاداری کی لغویات میں مبتلا ہو کر اپنے اصل کمالات سے بے خبر رہتے، اگر خدا کی طرف سے اشارہ نہ ہوتا۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ مالیوں کی بے پروائی سے کئی درختوں میں دیمک لگ گئی۔ باغ کو آئندہ بدنظمی کے نتائج سے بچانا اشد ضروری تھا اور محفوظ علی صاحب نے دفتر سے کچھ دنوں کی رخصت چاہی کہ گانوں جا کر باغ کی نگرانی کے لئے مناسب انتظام کر سکیں۔ لیکن ان کے افسر نے جو ان سے بہت جلتا تھا چھٹی نہیں دی اور محفوظ علی صاحب کو یقین ہو گیا کہ اگر انسان کو اپنی عزت آبرو عزیز ہے تو وہ نوکری نہیں کر سکتا۔ چنانچہ انھوں نے استعفا دے دیا اور اس کے بعد جب کبھی ملازمت ترک کرنے کا ذکر آتا تو وہ صاف صاف کہہ دیتے کہ اہل ذوق کے لئے نوکری کرنا بڑی غلطی ہے اور انھوں نے یہی محسوس کر کے اپنا دامن چھڑا لیا۔

ملازمت سے استعفا دینا معمولی کام نہ تھا۔ محفوظ علی صاحب کی وہ رشتہ دار جنھوں نے ان کو پالا تھا یہ خبر سن کر کہ انھوں نے استعفا دیدیا ہے اور اب کہیں کسب معاش کی غرض سے نوکری چاکری کرنے کا ارادہ بھی نہیں ہے اس قدر خفا ہوئیں کہ انھیں اپنے گھر میں قدم رکھنے کی ممانعت کر دی۔ محفوظ علی صاحب کی بیوی جو کبھی بھولے سے کسی خادمہ کو بھی نہیں گھرکتی تھیں یکایک بدمزاج ہو گئیں، ہر گھڑی محفوظ علی صاحب سے جھگڑنے لگیں اور کبھی تو گالیوں پر اتر آتیں، محفوظ علی صاحب کے تمام دوست جو انھیں دنیاداری

کے راستے پر چلانا چاہتے تھے ان کو جا و بے جا نصیحتیں کرنے لگے اور ان کو ایسا بیزار کر دیا کہ وہ تعلقات منقطع کرنے پر مجبور ہو گئے۔ سب سے زیادہ محفوظ علی صاحب پر یہ شاق گذرا کہ وہ لوگ جو ایک زمانے میں ان کا ادب کرتے تھے ان پر ہنسنے اور ان کو حقارت کی نظروں سے دیکھنے لگے، لیکن محفوظ علی صاحب کی ہمت ایسی تھی کہ وہ ساری جگ ہنسائی برداشت کرتے گئے اور اپنے فن میں ایسے محو ہوئے کہ ان کو دنیا و مافیہا کی مطلق خبر نہ رہی۔

ناظرین کا شک دور کرنے کے لئے مجھے پھر یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایک شغل کو جو بہت معمولی سمجھا جاتا ہے اور جس کے لوازمات محض گرہ میں دام اور معدے میں گنجائش رکھنا فرض کیا گیا ہے، محفوظ علی صاحب کے کمال نے ایک بالکل نئی حیثیت دے دی تھی اور اس کا درجہ مصوری، شاعری، انشا پردازی اور خطابت سے کچھ کم نہیں بلکہ فرداً فرداً مقابلہ کیا جائے تو ان سب سے بلند ہی ثابت کر دیا تھا۔ شاعر صرف شعر کہتا ہے، مصور صرف تصویر بناتا ہے۔ لیکن محفوظ علی صاحب نے اپنے فن کو ان تمام فنون لطیفہ کا مجسمہ بنا دیا تھا۔ ایک خوبی ان کے فن میں یہ تھی کہ آرزوئیں اور خواہشیں پیدا کرنے کے ساتھ وہ انھیں پوری بھی کرتا جاتا تھا، محض تماشا نہیں بلکہ باعث تسکین و تسلی بھی تھا۔

عزیز و اقارب کی خوشنودی اور دنیا دار دوستوں کے حسن ظن سے ہاتھ دھونا محفوظ علی صاحب کی ایثار پسند طبیعت کے لئے کافی نہ تھا۔ انھوں نے اپنی ذات کے تمام جوہر بھی اپنے فن کے صدقے کر دئے۔ کالج میں انھوں نے عربی فارسی کی بہت اچھی تعلیم پائی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں انھوں

نے شعر بھی کہے تھے۔ چند رسالوں کے مدیر جو ان کی غزلیں اور تنقیدی مضامین شائع کر چکے تھے۔ نہایت خلوص سے ان کی نسبت طرح طرح کی ہمت افزا پیشین گوئیاں کرتے تھے اور انھیں امید تھی کہ آسمانِ ادب پر عنقریب ایک نیا ستارہ چمکنے والا ہے۔ جس کے سامنے اوروں کی روشنی ماند پڑ جائیگی، محفوظ علی صاحب نے ملازمت اختیار کرنے کے بعد بھی اپنی ادبی دلچسپیاں جاری رکھیں لیکن جب سے ان میں اپنے فن کا ذوق پیدا ہوا انھوں نے اپنے ذہنی قویٰ کو ادبی شہرت حاصل کرنے میں صرف کرنا ناجائز سمجھا۔ رسالوں کے مدیر فرمائشیں کرتے کرتے تھک گئے، ان کے کلام کے شائقین دیوان کے انتظار میں بیٹھے رہ گئے۔ مگر محفوظ علی صاحب آموں کی تعریف کے سوا اور کسی سلسلے میں اپنی ادبی قابلیت دکھانا حرام سمجھتے تھے۔ پھر بھی ان کی ذہانت کا سکہ ایسا جما ہوا تھا کہ جب انھوں نے اپنے باغ کے آموں کی فہرست شائع کی جس میں ان کے آموں کی خوبیاں بیان کی گئی تھیں تو چند مہینوں میں اس کے کئی ہزار نسخے بک گئے اور وہ اردو زبان کی فصاحت اور بلاغت کے بہترین نمونوں میں شامل ہو گئی۔ یہ تو سب ہی کہتے ہیں کہ محفوظ علی صاحب کی فہرست پڑھنے کے بعد سے انھیں آم کھانے میں خاص لطف آنے لگا ہے، مگر مجھے بہت سے ایسے لوگ بھی ملے ہیں جنھیں وہ فہرست حفظ ہے اور اسے آم کے قدر دانوں کی الہامی

کتاب کہنا محض ایک مسلمہ عقیدہ نقل کرنا ہے۔

وہ لوگ جو محفوظ علی صاحب کی فہرست کے ادبی حسن پر جان دیتے ساتھ ساتھ اس پر افسوس بھی کرتے جاتے کہ اپنے قلم کی گل کاریوں کے لیے انھوں نے آموں سے کوئی اور بہتر موضوع نہیں پسند کیا لیکن وہ تو اپنے فن میں ایسے غرق ہوئے تھے کہ ان کے کل احساسات اسی فن تک محدود تھے ان کی بیوی ان کو چھوڑ کر اپنے میکے چلی گئیں اور وہ مہینوں تک الم غلم کھاتے رہے بنئے نے قرضے کی ادائگی میں ان کا مکان قرق کرا لیا۔ اور انھوں نے اپنا بستر اٹھایا اور ایک ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں جا کر پڑ رہے۔ بور نکلنے کے بعد سے آموں کے پکنے تک ان کا وقت زیادہ تر باغ میں گذرتا تھا اور جب آم کی فصل ختم ہو جاتی، وہ تاجران ابنہ کی فہرستیں پڑھا کرتے اور آموں کے متعلق خط و کتابت کیا کرتے۔ ان کی محویت کا یہ عالم تھا کہ دھوپ چھاؤں گرمی جاڑا ان کے لئے سب ایک تھا۔ ان کا سال دو حصوں میں تقسیم تھا، ایک وہ جب کہ آم کھانے اور کھلانے کو ملتے تھے، دوسرا وہ جب آم نہیں ہوتے تھے۔

افسوس کہ فلک سفلہ پرور اہل کمال سے صرف ایثار کا تقاضا نہیں کرتا بلکہ ضد میں ان کو ان چیزوں سے بھی محروم کر دیتا ہے جو ان کے کمال کے لئے لازمی ہیں۔ محفوظ علی صاحب کا پینتیس سال کی عمر میں معدہ ایسا خراب ہو گیا کہ طبیبوں نے آم کھانا تک منع کر دیا۔ لیکن جیسے محبت کا ایک وہ درجہ ہوتا ہے جب عاشق معشوق کی ہستی سے بے نیاز ہو جاتا

ہے اور وصل کی ہوس اس کے دل سے بالکل غائب ہو جاتی ہے۔
محفوظ علی صاحب کمال کے اس درجے پر پہنچ گئے تھے، جب آم کی تعریف کرنے کے لیے اس کا کھانا کیا چکھنا بھی ضروری نہ تھا، اور وہ محض رنگ اور خوشبو سے اس کا مزہ اور وہ کیفیت جو اس کے کھانے سے پیدا ہوتی تھی اس تفصیل اور صحت سے بیان کر دیتے تھے کہ کھانے والوں کو ان کے ادراک کی باریک بینی پر حیرت ہوتی محفوظ علی صاحب نے یہ مصیبت کئی سال تک برداشت کی۔ آموں کی فصل میں ان کی مجلسیں ہوتی رہیں اور اپنی مجبوری کے باوجود وہ اپنے نازک احساس اور ادراک اور تصوّر کے کرشمے دکھاتے رہے۔

بڑھاپے کے ساتھ ان کے مذاق پر تصوف کا بہت گہرا رنگ چڑھ گیا تھا اور ان کے فن میں مذہبیت کا جذبہ نمایاں ہونے لگا۔ آموں سے عشق انھیں پہلے تھا اور آموں کی تعریف اکثر وہ ان الفاظ میں کیا کرتے تھے جو شاعر اور صوفی معشوق کے لیے استعمال کیا کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ عشق نے انھیں "کفر" بھی سکھا دیا اور کبھی کبھی آموں پر گفتگو کرتے ہوئے وہ ایسے خیالات کا اظہار کرتے تھے جنھیں شاعروں کے فرضی واعظ مفتی اور ناصح نہیں بلکہ اچھے خاصے سیانے آدمی بھی قابل اعتراض قرار دے سکتے تھے۔ مگر محفوظ علی صاحب کا جذبہ اس قدر شدید تھا اور ان کی محویت اتنی کامل کہ کسی کو کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوتی۔ بڑھاپے میں انھیں تنگ نظری کے جور و ستم سے کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔
کسب معاش نے مجھے وطن سے دور زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا اور جب

محفوظ علی صاحب کا انتقال ہوا تو میں وطن میں موجود نہ تھا، لیکن اس دردناک خبر کے سننے کے چند مہینے بعد ہی مجھے کچھ دنوں کی مہلت ملی، اور محبت اور عقیدت مجھے مرحوم کی قبر پر کھینچ لے گئی۔ مرحوم کے آخری سال بہت تنگی میں گذرے تھے یہاں تک کہ انھیں اپنا باغ جو انھیں جان سے بھی زیادہ عزیز تھا، ٹکڑے ٹکڑے کر کے بیچ دینا پڑا تھا۔ قصبے کے لوگوں میں سے بہت ایسے تھے جنھیں مرحوم کا نام تک یاد نہ تھا مگر خدا خدا کر کے کسی نے مجھے ان کی قبر کا مقام بتا دیا اور میں بیتابی سے بھاگتا ہوا وہاں پہنچا۔ قبر کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ وہ شخص جس کا وطن کے سب لوگ نام تک بھول گئے تھے کس قدر بلند رتبے کا ولی تھا اور مشیت ایزدی نے اس کی آرزوؤں کا کتنا پاس کیا تھا ان کی قبر سے میں سمجھتا ہوں خاص اس مقام سے جہاں مرحوم کا دل ہوگا۔ ایک آم کا درخت نکلا تھا اور جس انداز سے وہ ہوا میں جھوم رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے بہت جلد ایک شاندار درخت کی صورت اختیار کر لی ہوگی۔ کاش وہ لوگ جو مٹکے شاہ اور دیوانے شاہ کی فرضی قبروں پر ہجوم کرتے ہیں، محفوظ علی صاحب کی قبر کو اپنا مرجع بناتے، ان کا آخری معجزہ دیکھ کر اپنا ایمان پختہ کرتے اور بارگاہ تعالیٰ میں اپنی دعائیں ایسے کامل بزرگ کے ذریعے سے پہنچاتے جن پر نظر التفات ہونے کا خدا تعالیٰ نے ایسا روشن ثبوت دیا تھا۔

پتھر

غلام احمد ایک کھاتا پیتا نوجوان آدمی تھا، اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹا چھت کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا اور سوچ میں پڑا تھا، "میں ہمیشہ پلنگ پر لیٹا کسی سوچ میں پڑا رہتا ہوں" اس نے اپنے آپ سے کہا "اور کبھی کچھ نہیں کرتا، لیکن میں کروں کیا؟ مجھے ایک نیا مکان تلاش کرنا ہے یہ تو سچ ہے لیکن نیا مکان آخر کوئی کہاں ڈھونڈتا پھرے؟" "اور اگر مجھے مکان میں سب سے ذلیل کمرہ نہ ملا ہوتا" اُس نے جھلا کر کہا اور پھر جب ایک گاڑی پاس سے گذری اور منوں گرد و غبار اس کے کمرے میں جھونک گئی "تو شاید مجھے یہ تکلیف نہ اٹھانی ہوتی۔" اس کے دماغ میں یہ خیال اس وقت نہ آیا کہ کمرہ اور کسی کام کے لئے موزوں نہیں تھا۔ اس کا دروازہ سڑک پر کھلتا تھا، اس لئے وہ اس کی بیوی کے لئے مناسب نہیں تھا اور وہ اتنا بڑا تھا کہ اسے باورچی خانہ بنانا یا نوکروں کو دے دینا بھی ناممکن تھا۔

دوپہر کا وقت تھا، گرمی بہت شدت کی تھی اور دم گھٹ رہا تھا

اس لئے غلام احمد اپنے غصے کو نہ روک سکا۔ وہ اس گرمی پر خفا ہو گیا جو اسے لیٹے لیٹے بھی پسینے سے بھگو رہی تھی، چھت پر کہ وہ کافی سفید نہیں تھی، ان کتابوں پر جو ایک کونے میں پڑی تھیں اور جن پر اتنی گرد جم گئی تھی کہ وہ کوڑے کرکٹ کا ڈھیر معلوم ہو رہی تھیں۔ اور جب اپنے نوکر کا خیال کیا، جو اتنا سست تھا کہ اس کا کمرہ سال میں ایک مرتبہ بھی صاف نہیں کرتا تھا، اور اپنی بیوی کا جو گھر میں کسی قسم کا انتظام نہیں کر سکتی تھی اور جس کے کپڑوں سے پسینے کی بہت تیز بدبو آتی تھی تو اس کا بدن غصے سے کانپنے لگا اور وہ چلا اٹھا "یا خدا، اگر یہی گرمی اور یہی نوکر اور یہی بیوی رہی تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

وہ پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس امید میں کہ شاید بیٹھنے سے کچھ آرام ملے۔ کچھ دیر تک وہ زمین کی طرف گھورتا رہا۔ اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ پھر اس نے آنکھ اٹھائی، اس طرح سے کہ گویا کوئی اسے مجبور کر رہا ہے، اور اس نے وہ کتابیں دیکھیں جن پر مٹی برسوں سے جمی ہوئی تھی، وہ میز جس پر اس نے بیٹھنا چھوڑ دیا تھا اور جس پر اب پرانے اخبار، کتابوں کے پھٹے ورق، خالی دوات، بے نب کے قلم رکھے تھے، اور پھر اپنے پلنگ اور اپنے اوپر نظر ڈالی۔ ہر چیز گرد میں اٹی ہوئی تھی اور ہر چیز سے معلوم ہوتا تھا کہ صرف اسے غصہ دلانے کے لئے کمرے میں آ گئی ہے۔

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے عاجز آ کر پھر اپنے آپ سے پوچھا "یہ سب چیزیں آخر کیوں میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی ہیں اور

مجھے غصہ دلا رہی ہیں؟ میں نے آخر کیا جرم کیا ہے؟" اور اسی فکر میں اس کا سر جھک گیا۔ "شاید اس کی وجہ یہ ہے" اسے ایک بارگی خیال آیا "کہ میں بالکل کچھ نہیں کرتا ہوں۔ چار یا پانچ دن سے میں پلنگ پر پڑا ہوں۔ میرے پسینہ نکلتا رہتا ہے اور میں اپنے نکمے پن پر غور کرتا رہتا ہوں۔ اگر میں کسی کام میں مشغول ہوتا تو مجھے اپنے کمرے اور مکان کی فکر نہ ہوتی، میں خاموش اور متین اور خوش مزاج ہوتا۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ میں ایک بے کار، نکما، کاہل، نالائق، بزدل، بیوقوف آدمی ہوں! اگر میں اپنے نوکر پر سختی کرتا تو اس کی کیا مجال تھی کہ کوئی چیز صاف ستھری نہ رکھتا اگر میں ٹھیک وقت پر اسے ہر کام کے لئے حکم دیتا۔ لیکن کبھی میں شرما جاتا ہوں، کبھی کاہلی سوار ہوتی ہے۔ ہر کام کو ٹالتا رہتا ہوں۔ اگر میں اپنی بیوی سے کہتا کہ صاف ستھری رہے تو وہ ضرور میرا کہنا مانتی۔ مگر میں اس سے کہتا ہی نہیں ہمیشہ انتظار میں رہتا ہوں سمجھتا ہوں کہ سب کچھ آپ ہی آپ ہو جائے گا۔ اور پھر خفا بھی ہوتا ہوں ...... میں بھی کیسا احمق ہوں!" اور اس نے اپنا سر تکیے پر دے مارا۔

کچھ دیر تک وہ پلنگ پر ویسے ہی پڑا رہا لیکن اُسے سوچ میں مبتلا ہونے کا اچھا موقع ملا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے نکمے پن پر غور کرنے لگا۔ شادی کے بعد جو دو سال گذرے تھے جنھیں اس نے پوری طرح سے ضائع کیا تھا اسے سب سے پہلے یاد آئے۔ ان دو سالوں میں وہ اپنی بیوی سے بالکل تنگ آگیا تھا، اگرچہ پہلے وہ اسے بہت پسند تھی۔ اس نے دنیا سے قطع تعلق کر لیا تھا اور دنیا نے اس سے۔ اور زندگی میں اس کے لئے

کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ پھر اسے وہ دن یاد آئے جب اس میں جوانی کا جوش تھا اور زندگی اس کے لئے بے معنی اور بے لطف دنوں اور راتوں کا ایک سلسلہ نہیں بن گئی تھی۔ اس زمانے میں وہ کھیل کود میں شریک ہوا کرتا تھا اور اپنے کالج کی طرف سے کئی مرتبہ ہاکی کے ٹورنمنٹ میں بھی کھیلا تھا۔ اس زمانے میں وہ عاشق بھی ہو گیا تھا۔ لڑکی خوبصورت اور سلیقے کی تھی اور اسے غلام احمد سے امیدیں بھی بہت تھیں لیکن وہ ایک بارگی اسے چھوڑ چھاڑ کر چلا گیا اور صرف تھوڑی سی جائداد کے لالچ اور اپنے باپ کے ڈر سے اپنی موجودہ بیوی سے شادی کرنے پر راضی ہو گیا مگر وہ اس سے نہ انکار کر سکتا تھا اور نہ اسے بھول سکتا تھا کہ اس نے عشق کے حوصلوں کو طبیعت کی کمزوری کی وجہ سے چھوڑا تھا اور اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اپنی آزادی اور اصل خوشی کو لڑ کر حاصل کرے۔ اپنے واسطے جو زندگی اس نے پسند کی تھی وہ صرف ایک چھوٹی کمینی طبیعت کو بھا سکتی تھی۔ "ہاں میں کمزور ہوں، بزدل ہوں ورنہ اب تک ضرور کچھ کر دکھاتا۔ میری بیوی سمجھ دار صاف ستھری ہوتی بجائے اس گٹھل دماغ کی عورت کے جو جانوروں کی طرح جدھر ہانکی گئی ادھر چلتی ہے، خود بیوقوف ہے اور دوسرے کو بھی بیوقوف بنا دیتی ہے۔ ہائے میں کیا نہیں کر سکتا تھا۔

ایک دل آویز خواب کے مانند اس کے سامنے ایک محل کی تصویر کھنچ گئی چاروں طرف شام کا اندھیرا چھایا ہوا تھا لیکن محل کی در و دیوار سے ایک ایسی، گہری، سچی مسرت کی کرنیں نکل رہی تھیں کہ اسے مایوسی کی ہوا

تک نہیں لگ سکتی تھی۔ اور اس محل میں ایک میاں بیوی رہتے تھے جن کی عمر دوسروں کی خدمت میں گزر رہی تھی اور جو اپنی بھلائی دوسروں کی خوشی میں پاتے تھے۔ اس مکان کی روح رواں، اسے یقین تھا۔ وہی لڑکی ہے جس سے اسے محبت تھی اور جس کے ساتھ اس نے بے وفائی کی تھی وہ مجھے ہر طرح سے آدمی بنا دیتی۔ میری طبیعت کو مضبوط کر دیتی لیکن مجھ میں اتنی صلاحیت بھی ہے؟ مجھ جیسے بزدلے کو بھلا کوئی بہادر بنا سکتا ہے"۔ مگر اس زندگی کی تصویر نے جو اس کے لئے ممکن تھی اس کی موجودہ حالت کو اور ناقابل برداشت کر دیا۔ یہ احساس کہ وہ اب ایک بالکل بے فائدہ، بے معنیٰ، بے لطف زندگی بسر کر رہا ہے غلام احمد کے دل میں کانٹے کی طرح چبھنے لگا۔

اس نے اپنے آپ کو بہت یقین دلانے کی کوشش کی کہ اب اس کے لئے کوئی امید باقی نہیں، مگر اس کی ابتدائی جوانی اور عشق کی یادگاروں نے باوجود ایسی مایوسی کے جو وہ اپنے ساتھ لائیں۔ اس کے تصوّر میں حوصلہ پیدا کر دیا۔ ان یادگاروں میں لپٹا ہوا ایک اور واقعہ اسے یاد آجاتا تھا۔ جب اس لڑکی نے جس سے اسے محبت ہو گئی تھی۔ اس کی حکمت عملی اور ہمت کی داد دی تھی اور اس وقت اس کا چہرہ خلوص اور دلی خوشی سے روشن تھا۔ کالج کے اسٹاف اور طالب علموں میں کچھ جھگڑا ہو گیا تھا

غلام احمد کی کوششوں سے معاملہ صاف ہو گیا۔ غلام احمد کو اپنی حرکت پر ہمیشہ تعجب ہوتا رہا اور یہ اس کی سمجھ میں کبھی نہ آیا کہ اسے ایسے معاملے میں دخل دینے کی جرأت کیسے ہوئی۔ لیکن اسے پوری طرح سے کامیابی ہوئی تھی اور وہ دراصل اس تعریف کا مستحق تھا۔ غالباً وہ دوسرے واقعات کے ساتھ اسے بھی بھول جاتا لیکن لڑکی تعریف کرتے وقت مسکرائی تھی اور یہ مسکراہٹ غلام احمد کے دل پر ایک نقش بن گئی تھی جو اس کے مٹائے نہ مٹ سکا۔ اگر وہ اپنے اوپر لعنت ملامت کرتا ہوتا تو اس مسکراہٹ کی یادگار اس کی طبیعت نرم کر دیتی۔ رنج اور مایوسی کے دنوں وہ ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بن کر اسے تر و تازہ کر دیتی۔

کبھی کبھی جیسے اس وقت وہ امید کا پیغام لاتی تھی غلام احمد کا پسینہ سوکھنے لگا، اعضاء حرکت پر رضامند ہو گئے، رگوں میں خون دوڑنے لگا اور اسے یقین سا ہونے لگا کہ وہ اتنا کمزور اور بزدلا نہیں جتنا کہ وہ سمجھتا ہے اور ابھی اس کے سدھرنے کی امید ہے۔ اس نے دنیا میں بہت کچھ کھویا تھا لیکن اس کی وجہ سے سب کچھ کھو بیٹھنا لازم نہیں ہو گیا تھا۔ وہ اسی گھر میں اور انھیں لوگوں میں پھر زندہ ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ناممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے ساتھ دوسروں میں بھی روح پھونک دے۔

غلام احمد کا دل نئے جوش میں دھڑکنے لگا۔ ہاتھ پاؤں کانپنے

لگے جب اس نے یہ عہد کیا کہ اب ہمیشہ سختی سے اپنے ارادے پر قائم رہے گا، اپنے نوکر کو نکال دے گا، اگر اس نے پھر کبھی کسی قسم کی بے تمیزی یا کاہلی کی، اپنی بیوی کو مجبور کرے گا کہ گھر کا انتظام ٹھیک طرح سے کرے اور کپڑے صاف رکھے۔ وہ خود محنت و مشقت کرے گا۔ اور دوسروں کے لئے نمونہ بنے گا۔

یہ عہد کر کے اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری، آنکھیں مل کر ادھر اُدھر اس اطمینان اور خوشی سے دیکھنے لگا کہ گویا اس کا کمرہ صاف ہے، اس کی بیوی شائستہ وہ خود محنتی، چست اور دوسروں کا رہنما اور خادم اور پھر وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔ دل آرزو کی موجوں سے پھٹا جاتا تھا اور وہ اس انتظار میں بیتاب تھا کہ اپنے ارادے کا امتحان لے، دوسروں کو اپنے عمل کے ذریعے سے ایک بہتر زندگی کا پیام دے اور جلد سے جلد اس انقلاب کی خبر دنیا تک پہنچائے۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کتنی دیر سویا ہے، لیکن یہ وہ بغیر آنکھ کھولے بتا سکتا تھا کہ شام ہو گئی ہے۔ ہوا نرم تھی اور کسی قدر ٹھنڈی زمین اب آسمان سے ترحم کی درخواست نہیں کر رہی تھی بلکہ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ اطمینان سے بیٹھ کر بجھے ہوئے دل سے غور و فکر کر رہی ہے اور اپنے بچوں سے بھی یہی چاہتی ہے۔ علاوہ اس کے غلام احمد نے بچوں کو اپنے دروازے کے قریب کھیلتے اور ہنستے سُنا۔ یہ بھی

شام ہونے کی دلیل تھی

جب وہ رفتہ رفتہ پوری طرح بیدار ہو گیا تو اسے اپنا ارادہ یاد آیا لیکن اسے اس سے تسکین یا تازگی نہیں حاصل ہوئی۔ وہ اب اس کے دل پر ایک بھاری بوجھ کی طرح دھرا ہوا تھا اور اس سے نجات ملنے کی کوئی امید نہیں تھی غلام احمد یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس ارادے کا پورا کرنا اس پر فرض ہے لیکن اسے یقین ہو گیا کہ وہ ایسا نہیں کرنے پائے گا۔ میں نے کیوں بیٹھے بٹھائے یہ ارادہ کر لیا؟ کیوں اپنے سر یہ نئی مصیبت لے لی؟ کیا میرا ضمیر مجھے پہلے ہی سے کافی ملامت نہیں کر رہا تھا؟ اب مجھے ہر لحظہ یہ خیال رہے گا کہ میں نے ایک بات کا ارادہ کر لیا ہے اور اس پر قائم رہنا ضروری ہے۔ ہمیشہ ہر جگہ میں یہی سوچا کروں گا اور دل ہی دل میں شرمایا کروں گا۔ جو تھوڑا بہت اطمینان قلب مجھے حاصل تھا وہ بھی اب گیا اب جب کبھی مجھے نیند کی خواہش ہوگی تو میں محسوس کروں گا کہ مجھے جاگتے رہنا چاہئے جاگتا رہوں گا تو یہ خیال ہوگا کہ کچھ کروں۔ کچھ کروں گا تو یہ فکر ہوگی کہ اتنا کرنا کافی نہیں۔۔۔۔ اور آخر میں کروں تو کیا کروں؟ اگر میں اپنی بیوی سے کہوں کہ صاف رہا کرو تو مسکرا دے گی اور کہے گی "اب میں ایسی میلی بھی نہیں ہوں یا وہ بے نہائے دھوئے کپڑے بدل لے گی اور مجھے اسی پر قانع ہونا پڑے گا لیکن میں نوکر کو کیا کروں؟ اگر اسے نکال دوں تو کوئی دوسرا آئے گا جو اتنا ہی کاہل ہوگا بلکہ ممکن ہوگا کہ اور اوپر سے چور بھی ہو اور یہ کمبخت اتنا زبان دراز ہے کہ میں اس کی کاہلی یا قصور ثابت ہی نہیں کر سکتا۔

پھر یہ کہ میں اپنے لئے کام کونسا نکالوں؟ یونیورسٹی میں دوبارہ داخل ہونا تو

فضول ہے کیونکہ میری عمر بہت ہوگئی ہے۔ نوکری بھی نہیں مل سکتی کیونکہ میرے پاس کوئی ڈگری نہیں۔ صرف ایک صورت ہے کہ سیاسی کام شروع کردوں لیکن نہ میرے پاس روپیہ ہے، نہ میرا کوئی اثر ہے، تقریر کرنا بھی میرے بس کی بات نہیں پھر میں کیا بنا لوں گا۔ لوگ یہ سمجھیں گے کہ میں روپیہ کمانا یا سطحی شہرت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ارادہ کرنے کو تو کرلیا، لیکن کوئی کام بھی ہو؟

وہ کلبی فلسفیوں کے انداز سے اپنی حالت اور اپنے ارادے پر مسکرایا اور اس سے اسے ایک گونہ اطمینان ہوا، گو وہ اپنے دل میں سمجھتا تھا کہ دلیلیں اس کو اپنے ارادے سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا نہیں دلا سکتیں اور اس کا ضمیر اسے یہ ارادہ یاد دلا کر شرمندہ کیا کرے گا لیکن یہ وقت اسے دور معلوم ہوتا تھا۔ اس نے لمبی سانس لی اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا کہ پھر اونگھ جائے۔

نیند کا انتظار کرتے ہوئے وہ بچوں کا اودھم، ہنسی اور گالی گلوچ سننے لگا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ وہ کون سے کھیل کھیل رہے تھے۔ کیا کیا غلطیاں کر رہے تھے اور اس نے کوشش کی کہ کھیل کی رفتار پر غور کرتا رہے لیکن دفعتہً سارا اودھم موقوف ہو گیا اور ایسا معلوم ہوا کہ سب بچے گونگے ہو گئے۔

اسے اپنے نوکر کی بھاری، موٹی آواز سنائی دی، وہ بچوں کو گالی دے رہا تھا اور نکال رہا تھا۔ پھر اس نے ایک بچے کے رونے کی آواز سُنی اور اپنے نوکر کو گلا پھاڑ کر چلاتے ہوئے جس سے وہ آواز دب گئی۔

غلام احمد کو بہت غصہ آیا۔ اسے یوں بھی پسند نہ تھا کہ اس کا نوکر بچوں پر خواہ مخواہ سختی کرے اور یہ تو وہ کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ان میں سے

کسی کو مار بیٹھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کمبخت کو جب موقع ملتا ہے تو سختی اور ظلم سے نہیں چوکتا اور اسے اس کی ان حرکتوں سے نفرت تھی۔ اس لئے اس نے قصد کر لیا کہ اٹھ کر اسے خوب ڈانٹے گا اور لعنت ملامت کی ایسی بوچھار کرے گا کہ نفرت وحقارت کا سارا انبار جو اس کے دل میں تھا نکل جائے۔ اس نے اپنے دل میں کہا "اس نے یہ حرکت پہلی بار نہیں کی ہے۔ یہ ہمیشہ یہی کرتا رہتا ہے۔" اسے یکایک یہ خیال آیا کہ یہ کمبخت ہمیشہ خود اس سے اور اس کی بیوی سے بھی بدتمیزی سے پیش آتا ہے اور کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ غلام احمد نے بلند آواز سے کہا "کبھی نہ کبھی تو اس سے سمجھنا ہے۔ آج ہی کیوں نہ فیصلہ ہو جائے؟" وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے نوکر کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

لیکن نوکر نہیں آیا، وہ اپنی مرضی سے کہیں اور چلا گیا۔ غلام احمد اس پر برس پڑنے پر آمادہ بیٹھا تھا کہ اسے اپنے ارادے کا خیال آیا۔ تقدیر نے اسے یہ موقع دیا تھا "یہی اسے پورا کرنے کا وقت ہے۔ نوکر سے بسم اللہ کردوں، پھر اپنی بیوی کی خبر لوں، پھر اپنی، پھر ساری دنیا کی۔ بس یہی وقت ہے۔" اس نے اپنے دانت اور مٹھیاں بھینچ لیں اور ابرو پر بل ڈال لیا۔ لیکن اس سے گھبراہٹ دور نہ ہو سکی جو اس پر غالب آرہی تھی اور جس نے اسے شک اور پس و پیش میں ڈال دیا تھا۔ وہ ڈانٹنے اور ڈپٹنے کو تیار بیٹھا تھا اور دل کڑا کر کے ایسا کر بھی گذرتا لیکن اصولاً یہ کرنا، اسے ایک مستقل دستورالعمل ہمیشہ کے لئے بنانا، اس خیال نے اس کی ہمت پست کر دی اور وہ پھر شک اور مایوسی کا شکار ہو کر بستر پہ گر پڑا۔

عین اسی وقت گویا واقعات نے غلام احمد کو پیش ڈالنے کی سازش کر لی تھی، یہ سنائی دیا کہ اس کا نوکر کھٹ پٹ کرتا، ملبے پنے تلے قدم رکھتا چلا آ رہا ہے اور ذرا دیر کے بعد وہ اس کے سامنے کھڑا تھا، ایک لمبا بھاری بھر کم آدمی جس کے چہرے سے بدتمیزی ٹپکتی تھی اور جس کے لبوں پر ایک خلقی طنز آمیز مسکراہٹ تھی جسے وہ کبھی دبانے یا چھپانے کی کوشش نہیں کرتا تھا

غلام احمد نے انتہائی کوشش کی کہ اس کی آواز سے اعصابی کمزوری نہ ظاہر ہو اور کہا "تم کہاں تھے؟"

اس کے نوکر نے سوال کو دہرایا "میں کہاں تھا؟" اور غلام احمد کو یہ محسوس ہوا کہ اس کے ہونٹوں پر معمولاً جو مسکراہٹ رہتی تھی وہ پھیل کر زہر خند بن گئی

"ہاں! ہاں! تم یہیں تھے۔ میں سن رہا تھا کہ تم نے ایک بچے کو مارا۔ بتاؤ تم نے اسے کیوں مارا؟"

"کیوں مارا؟ مارتا نہیں تو کرتا کیا؟ اگر ان لونڈوں کو نہ ماروں تو کل کو گھر میں گھس کر کھیلیں گے اور مجھے ان کی چیخم دھاڑ اچھی نہیں لگتی۔" نوکر جواب دیتا رہا اور آخر میں اس کی آواز نے ملامت کا لہجہ اختیار کیا۔

غلام احمد نے کمزور آواز میں کہا "بھلا اتنی سی بات پر کوئی بچے کو مارتا ہے۔" اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پلنگ ٹوٹ جائے گا اور وہ نیچے گر پڑے گا۔

"ماروں نہیں تو کام کیسے چلے۔ گالی سے تو مانتے نہیں۔ سنتے سنتے عادت ہو گئی ہے۔ ہر کوئی انھیں گالیاں دیتا ہے۔ مجھے مارنا ہی پڑتا ہے کم سے کم ایک لونڈے کو۔"

غلام احمد نے سُنا تھا کہ وہ لڑکا دوسرے دن کے بھاگ جانے کے بعد دیر تک روتا رہا۔ غالباً وہ سب سے چھوٹا تھا اسی لئے اسے سزا ملی۔ بہر حال اسے یقین تھا کہ صرف ڈانٹنے سے لڑکے بھاگ جاتے اور نوکر کا اس لڑکے کو مارنا محض ظلم تھا مگر وہ جانتا تھا کہ وہ اس کمبخت کو دلیل سے قائل نہیں کر سکتا اور اس کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ پس اس نے اس ذکر کو چھوڑ دیا جس سے اس کے نوکر نے نتیجہ نکالا کہ وہ ہار مان گیا ہے۔

غلام احمد نے حتی الامکان رعب سے کہا "اب تم کہاں جا رہے ہو؟"

"بی بی مجھے شہر بھیج رہی ہیں۔"

"اچھا جاؤ" غلام احمد نے کروٹ لے لی تاکہ نوکر اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے اور احتیاط کی غرض سے اسے اپنے بازو سے چھپا لیا۔ نوکر حقارت سے مسکرا کر چل دیا۔

غلام احمد نے نوکر کے جانے کی آواز سُنی تو اسے کسی قدر اطمینان ہوا۔ اپنی ناکامیابی سے اسے مایوسی نہیں ہوئی کیونکہ اس نے خود اس کی پیشین گوئی کی تھی لیکن اس کی اضطرابی حالت باقی رہی اور اس کے ساتھ گہری اندرونی بے چینی۔ اس کے دل سے ایک بوجھ ہٹ گیا (نوکر سے گفتگو کرنے کے بعد اس کا نیک ارادہ کافور ہو گیا تھا) لیکن اس کی سیرت پر ایسا دھبہ لگا تھا جس کا مٹنا ناممکن تھا اسے ایک دھندلا سا احساس تھا کہ اس کی موجودہ ناکامیابی کے نتائج گہرے اور دیرپا ہوں گے اور اگر آگے چل کر اس نے اور اس کی امیدوں نے سر اٹھایا تو اس کوشش کی یاد اسے مغلوب کر دے گی، اسے پچھاڑ دے گی گویا اس نے خودداری اور رفاہ عام کی سیڑھی پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن گر پڑا اور اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی اب پھر

ایسی کوشش کا کوئی امکان نہیں تھا لیکن خدا جانے کیا بات تھی کہ غلام احمد کو اس خیال سے ایک طرح کا اطمینان تھا۔ اب آگے چل کر نہ کوئی امید ہوگی، نہ کوشش نہ ناکامیابی کی ذلت، اگرچہ وہ اپنی بزدلی کو قابل حقارت سمجھتا تھا تاہم اس کے خیال سے اسے ایک قسم کی خوشی ہوئی۔ پرانے افیونی کی طرح وہ جان بوجھ کر نشے کے گھونٹ چڑھا رہا تھا۔ افیونی جانتا ہے کہ اس کا کیا انجام ہوگا۔ اسے اعتراف ہوتا ہے کہ اس کی زندگی سے بہتر زندگی ممکن ہے لیکن پھر ایک چسکی لے لیتا ہے تاکہ اپنے آپ کو یقین دلادے کہ بہتر زندگی اس کی قسمت میں نہیں ہے۔

پس غلام احمد بے حس وحرکت پلنگ پر پڑا رہا۔ کچھ دیر تک اس کے خیالات اور تصورات اور جذبات بے روک ٹوک امنڈتے رہے اور وہ بے پروائی سے ان کی حرکت کا مشاہدہ کرتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر میں چپ چاپ رہوں تو یہ طوفان خود بخود بیٹھ جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ جب کچھ دیر کے بعد اس کی بیوی نے دروازہ کھولا تو اس کا اطمینان قلب لوٹ آیا تھا، اس کا اضطراب جاتا رہا تھا اور اس کی وہی حالت تھی جو ہمیشہ رہتی تھی۔

اس کی بیوی نے چپکے سے کہا "میں نوکر سے میوہ منگانا بھول گئی ذرا چلے جائیے اور لے آتے"۔ اس نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنی بیوی کی بات تو سُنی لیکن وہ اس پر غور کر رہا تھا کہ اس کا ذہن اس وقت ایک تاریک خالی فضا کی طرح ہے جس میں گذری ہوئی باتوں کی یاد بلکہ خیالات بھی تصویروں کی شکل میں نظر آتے ہیں۔

اس کی بیوی نے پوچھا:۔

"تم نے سُنا ؟"

"ہاں"

"پھر چلے جاؤ نہیں تو دوکانیں بند ہو جائیں گی ۔"

"اچھا"

اس کی بیوی چلی گئی ۔ اس کا ذہن اب بھی ایک تاریک خالی فضا تھا اور وہ انتظار کر رہا تھا کہ اس میں خیالات کو آتے ہوئے دیکھے ۔ لیکن اسے دیر تک انتظار کرنا پڑا اور اس کی آنکھ لگ گئی ۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ چونک کر اٹھا ۔ اندھیرا ہو چکا تھا ۔ کیا دوکانیں بند ہو گئی ہوں گی ؟ اس کے پاس کوئی گھڑی نہیں تھی (حالانکہ اس کے نوکر کے پاس دو تھیں) اس لئے اسے نہیں معلوم ہو سکا کہ کیا بجا ہے ۔ اس نے اپنے آپ کو یہ یقین دلانا چاہا کہ اب دیر ہو گئی ہے لیکن جیسا کہ کمزور اعصاب والوں کا قاعدہ ہے اس کے پس و پیش نے دو حریفوں کی نزاع کی صورت اختیار کر لی جن کے بیچ میں اس کا ارادہ معطل ہو کر رہ گیا ۔ ان حریفوں میں سے ایک نے کہا "بہت دیر ہو گئی ہے ۔" دوسرے نے کہا "پھر بھی کوشش تو کرنا چاہئے ۔" پہلے نے پوچھا "اس سے کیا فائدہ ؟" دوسرے نے جواب دیا "اگر دوکانیں بند بھی ہو گئی ہیں تو سیر ہی ہو جائے گی ۔ اس سے ہمیشہ فائدہ ہوتا ہے ۔ علاوہ اس کے سارا دن لیٹے لیٹے گذرا ہے ۔" پہلے نے اصرار کیا "نہیں جی فضول بات ہے ۔ اس وقت جانے کے کیا معنی ہیں ؟ میلی گلیوں میں سے گذرنا جن میں دھواں بھرا ہے ، ایسے لوگوں سے ملنا جن سے کوئی دلچسپی نہیں ، مجبوراً ہنسنا بولنا جب کہ دل خاموشی چاہتا ہے ،

وہی بیکار بیٹھنا، گپ شپ، ہنسی مذاق جس میں نری زحمت ہے۔ کچھ فائدہ نہیں
دوسرا حریف خفا ہو کر چپ ہو گیا اور غلام احمد بدستور بے حس و حرکت لیٹا رہا
اور اس کا ذہن اب تک ایک تاریک خالی فضا تھا۔

جب اس کی بیوی نے زور سے دروازہ کھولا تو غلام احمد کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ اس کی بیوی نے اس کے انداز سے سمجھ لیا کہ اس کی فرمائش پوری نہیں کی گئی ہے اور وہ اسے بُرا بھلا کہنے لگی لیکن غلام احمد نے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور بے خبری میں اس کے ہونٹوں کو ہلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ بیوی نے آخر میں کہا کہ کھانا تیار ہے، اس سے درخواست کی کہ جلد آئے اور چلی گئی۔ اب بھی غلام احمد نے حرکت نہیں کی گویا کسی چیز نے اسے بستر سے جکڑ دیا تھا۔ اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی زندگی کا اٹل قانون ہے کہ وہ دن رات بے حس و حرکت پلنگ پر پڑا رہے اور صرف کھانا کھانے کے لئے اٹھا کرے۔ اس قانون کا تقاضا ہے کہ وہ کاہل، بزدل اور نکما بنا رہے اور اپنے ذہنی اور جسمانی جمود سے جو اس کے خمیر میں ہے لطف اٹھائے۔

خیال اور احساس کے ساتھ اس میں کچھ حرکت پیدا ہوئی۔ دقت سے وہ کھسک کر پلنگ کی پٹی پر آ گیا اور اپنا ایک بازو لٹکا دیا۔ اس کی ایک انگلی پتھر سے لگی جو زمین پر پڑا تھا اور وہ اسے اٹھا کر غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے یہ نہیں سوچا کہ پتھر کہاں سے آیا کیونکہ اسے دفعتاً یہ خیال آیا کہ اس میں اور اس مجہول، بے ضرر پتھر میں کتنی مشابہت ہے۔ دونوں کی قسمت میں یہ لکھا تھا کہ جب تک انھیں کوئی چیز حرکت میں نہ لائے چپ پڑے رہیں اور دونوں اس پر قانع تھے۔

غلام احمد نے پتھر کو انگلیوں میں دبا لیا گویا وہ کوئی قیمتی چیز تھی اور دل میں پوچھنے لگا "کیا پتھر میں احساس اور خیال کی قوت ہے؟ کیا مجھ میں احساس ہے؟ کیا میں غور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں؟ لیکن یہ کونسا بڑا فرق ہے۔"

دفعتاً اس نے فتح مندی کے انداز سے، وجد کے عالم میں اپنے بازو کو گھمایا گویا مدت کے بعد بڑی بات معلوم کی ہے اور چلا کر کہا "ہاں! ہاں! میں بھی پتھر ہوں، بے شک میں پتھر ہوں!" کسی نامعلوم خوشی نے اس کے بدن میں سنسنی پیدا کر دی اور وہ یہ مسرت انگیز خیال دل میں لئے ہوئے کہ وہ پتھر ہے، اٹھا اور کھانا کھانے چلا۔

اس کی بیوی کو اس کے ہاتھ میں ایک پتھر دیکھ کر بہت تعجب ہوا۔

اندھیرا

ابھی سورج ڈوبا نہیں تھا، لیکن اس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ آسمان پر بادل پچھم کی طرف سر جھکائے سنہری کرنوں میں مانجھے ہوئے پیتل کی طرح چمک رہے تھے۔ ہوا دن بھر کی تھکی ہوئی رک رک کر چل رہی تھی۔ چڑیاں بسیرے کے لئے اونگھتے ہوئے درختوں پر جمع ہو رہی تھیں۔ بھگوان دین ایک پاسی اور منگل اسی گانوں کا ایک کرمی شہر سے گھر واپس جا رہے تھے۔ ان کے سامنے سڑک کے سفید تاگے کی طرح، جس کا سرا کھو گیا ہو، دور تک پڑی دکھائی دیتی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف جیسا کہ ہندوستان میں ہر جگہ پایا جاتا ہے نالے تھے۔ نالے کے پار کبھی ادھر کبھی کھیت اور ذرا دور درختوں کی آڑ سے جھانکتے ہوئے گانوں یا جھومتے ہوئے آموں کے کنج۔

رات اندھیری ہونے والی تھی اور ان کا گانوں ابھی بہت دور تھا، اس لئے دونوں قدم بڑھائے چلے جا رہے تھے مگر تھوڑی دیر کے بعد بھگوان دین ٹھہر گیا اور چاروں طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"اب سانجھ ہو گئی، دن دن تو پہنچ نہ پیہا[۱]۔ آؤ ذرا استائی لیں۔

---

[۱] پائیں گے۔

ستانے کی ضرورت پر سب سے بڑی دلیل ان کے پاس یہ تھی کہ دونو پسینے میں نہائے ہوئے تھے اور ہانپ رہے تھے۔ منگل بھی کافی تھک گیا تھا لیکن وہ بے کار دیر کرنے پر راضی نہیں ہو سکا۔

"ستائی کے کا کری ہو، سہج سہج چلے چلو۔ اندھیری رات ماں کا مالوم کا ہوئی جائے۔

"ہوئی کا جی ہے[1]؟ کونا کھجانا لیے جات ہو جو تم کا چورن کا ڈر ہے" بھگوان دین نے کہا اور سڑک کے کنارے ایک درخت کی جڑ پر جا کر بیٹھ گیا۔ منگل نے پورب سے بڑھتے ہوئے اندھیرے کی طرف دیکھا، پھر آگے کی طرف نگر بھگوان دین کے پاس ایک جگہ ڈھونڈھ لی۔

تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا:۔

"ہم کہن کہ رات اندھیری ہوئی ہے، سڑک جیسی ہے تم آپے جانت ہو۔ کہوں گڈھا ماں پیر پڑ گوا تو رات بھر بیٹھ کے کون ٹانگ سینکی ہے[2]"

"گڈھے وڈھے چھونا ہیں ہیں۔ تم یار اندھیارے ماں ڈرادت ہو" بھگوان دین نے مسکرا کر کہا اور اپنی بات کا اثر معلوم کرنے کے لئے اس نے منگل کی طرف دیکھا۔ منگل نے تیوری چڑھائی اور زمین کو گھورتے ہوئے جواب دیا:۔

"تم جیسے پہلوان کے ساتھ بھلا کون ڈرئی ہے۔ تم تو ایک ہاتھ ماں دس

---

[1] ہو گیا جائے گا   [2] سینکے گا۔

چورن کو لٹائی دیو۔"

" ای ماں گستہ[1] ہوئے کی کون بات ہے۔ ہم تو ایس ہنسی ماں کہہ دے رہن۔"
بھگوان دین کے لہجے میں اس قدر افسوس اور پشیمانی تھی کہ منگل کی خفگی جاتی
رہی لیکن اس نے اسے چھپانے کی کوشش کی اور کہا :۔

" جانت ہن تم پاسی جات کے ہو۔ لاٹھی باندھت ہو مگر دوسرے
آدمی کا کھیال تو رکھا کرو۔"

بھگوان دین نے اس کے جواب میں صرف اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا
ٹھنڈی سانس بھری اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

جب وہ اٹھ کر پھر چلے تو سورج ڈوب چکا تھا۔ پچھم کی طرف کچھ دھندلی
سی روشنی کے سوا راستہ دکھانے کے لئے اور کوئی سامان نہ تھا۔ سڑک جیسی خراب
اور خطرناک منگل نے بتائی تھی نہ تھی۔ مگر شام کے وقت راستہ چلنے والے کو ڈرانے
کے لئے، اگر وہ دل کا کمزور بھی ہو، سڑک کے دونوں طرف گڑھے کافی تھے
اور چھوٹی چھوٹی پلیاں بھی جن میں خواہ مخواہ خیال ہوتا ہے کہ چور چھپے بیٹھے ہیں۔
رفتہ رفتہ جو ذرا سی روشنی تھی وہ بھی جاتی رہی۔ سڑک بجائے سفید کے مٹیالے
رنگ کی ہوگئی۔ گڑھوں میں اندھیرا کالے پانی کی طرح بھر گیا۔ جھاڑیوں اور درختوں
نے ایک کالی کملی سی اوڑھ لی۔ درختوں پر چڑیاں چپ چاپ سو رہی تھیں اور
سوا منگل اور بھگوان دین کے قدموں کی آہٹ کے ہر طرف "گھنی" خاموشی

---

[1] غصہ ہونے

تھی۔

منگل کے ہاتھ میں لاٹھی تھی اور اتنا روپیہ بھی نہ تھا کہ اسے چوروں کا ڈر ہو لیکن اس کی حرکتوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے حواس قائم رکھنے کی خاص کوشش کر رہا ہے۔ اگر کبھی اس کا پیر بے اٹکل پڑتا تو وہ کانکھتا یا گالی دیتا یا اور کسی طرح سے اپنی جھنجھلاہٹ اور گھبراہٹ ظاہر کرتا۔ اگر کبھی کوئی چیز ہلتی یا چلتی نظر آتی تو وہ کانپ جاتا اور غور سے اس کی طرف دیکھنے لگتا۔

بھگوان دین نے اس کی کیفیت کو محسوس کیا اور دلاسے کے لئے کہنے لگا۔

"ہمری سمجھ ماں تو کبھو نہ آوا کہ لوگ بھلا ڈرات کاہے کا ہیں۔ جو کہوں جنگل ہوئے شیر چیتے ہوئیں، سانپ بچھو ہوئیں تو بات تو[1] ہے۔ ہیاں تو سب آپے آپ ڈرائے جات ہیں۔" اور یہ دکھانے کے لئے کہ اس کا اشارہ منگل کی طرف نہیں اس نے ایک بات اور جوڑ دی۔

"اب ہمرے اپنے گانوں دیکھو۔ کوؤ رات کا گھر سے دس کدم باہر ناہیں جات ہے۔ بھلا یو بات کا ہوئے؟"

لیکن منگل نے تقریر کے آخری حصے کا خیال نہیں کیا اور سمجھ گیا کہ بھگوان دین نے سارا حال معلوم کر لیا ہے اور اب اسے اپنی بہادری دکھانا چاہتا ہے۔ بھگوان دین نے اس کی بدگمانی اور بڑھا دی۔

"ہم سے سب اجار بار کہن رات کا ہواں نہ جاؤ۔ دن کے بارہ بجے

---

[1] تو ایک بات بھی ہے۔

شہید مردن پر نہ جاؤ، درکھت پر نہ چڑھو، یو نہ کرو، اور نہ کرو۔ ہم ایک نہ مانن، جو من ماں آوا سو کیا اور ابھیں تک دیکھو جندہ ہن

منگل نے اپنی جھنجھلاہٹ دکھانے کے لئے بجائے خود بھگوان دین پر حملہ کرکے اس کی بات کو غلط ثابت کرنا چاہا اور منہ بنا کر کہا:۔

"ہونھ! یو تو سب ہے مگر گانؤں ماں پار رسال جوں موچی مرگوا رہے اوسے پوچھو سبھے کہن کہ اے راستے پر تم کا وہی بھوت ملے ہے جون[1] دوئی برس پہلے ایک اہیر کا بیچھا کھس[2] رہا ہے۔ ایک نہ سنن آکھر بھوا[3] اکا دوئی دن بیہوس پڑے رہے۔ تیسرے دن ٹھنڈے ہوئی گئے۔

منگل کے لہجے سے بھگوان دین سمجھ گیا کہ اس نے اس کی بات بری مانی ہے مگر بجائے جواب دینے کے اس نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اب ای کا کوئی کا کرے۔ جی کا مرنا ہوت ہے اوکے حواس کب ٹھیک رہت ہن؟"

"ہم تو یو جانت ہن۔۔۔۔۔ آدمی کا نہ چور ڈرائے سکت ہن۔ نہ شیر چیتے۔ نہ بھوت پریت۔۔۔۔۔۔ آدمی کھودے[4] آپ کا ڈراوا کرت ہے۔۔۔۔ ہمرے چاچا سناوت رہن۔۔۔۔۔۔"

اور یہاں پر بھگوان دین نے ایک قصہ سنایا جو اس کے چچا کے بچپن

---

[1] جس نے [2] کیا تھا [3] ہوا کیا [4] خود ہی

کا ایک واقعہ تھا۔ اسی گاؤں میں جاڑے کے موسم میں ایک مرتبہ رات کے وقت کچھ لوگوں نے آگ جلائی تھی اور اس کے چاروں طرف بیٹھے ہاتھ پیر گرم کر رہے تھے۔ ہر طرف سے انھیں اندھیرا گھیرے ہوئے تھا ایسا اندھیرا جس میں ستاروں کی نازک شرمیلی روشنی زمین سے کہیں اوپر ہی رہ جاتی ہے جیسے تیر گھنے درخت کی شاخوں میں اٹک جاتا ہے۔ مگر یہ اس اندھیرے کا پیٹ بھرنے کے لئے کافی نہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک کالا ہیبت ناک دیو اس بیچاری آگ کو بھی تک رہا ہے کبھی ادھر سے کبھی اُدھر سے اس کی طرف لپکتا ہے اور اس کی گردن مروڑنے کی کوشش کر رہا ہے اور آگ ایک سہمی ہوئی چڑیا کی طرح کبھی جھپٹ کر اس کونے میں پناہ لیتی ہے کبھی اس میں۔ کچھ دیر تک تو لوگ یہ تماشا دیکھتے رہے لیکن رفتہ رفتہ ان پر بھی اس کا اثر پڑنے لگا اور آخر کار جب اندھیرا حملہ کرتا اور آگ اس سے بچنے کی کوشش کرتی تو ان کے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور وہ ایک دوسرے سے اور لس کر بیٹھ جاتے گویا انھیں اپنی جان بھی خطرے میں معلوم ہوتی تھی۔ اس وقت انھیں چاہئے تھا کہ کسی طرح کی گفتگو چھیڑیں اور اپنی توجہ دوسری طرف کرلیں۔ مگر جب کھیتی پر رائے زنی ہو چکی تو سب خاموش ہو گئے اور اندھیرے کے خوف کو دور کرنے کے لئے ان کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی کوئی ایک گھنٹہ تک سب ایسے ہی سہمے بیٹھے رہے اور کسی کے منہ سے ایک بات نہ نکلی۔ سونے کا وقت بھی آگیا لیکن آگ کے پاس سے کوئی نہ اٹھا۔

بھگوان دین کلہ چچا جو اس زمانے میں ایک لڑکا تھا اور اپنے بے تکے پن کے لئے مشہور تھا، سب کے چہروں کو دیکھ کر بول اٹھا:

"یہ تو جان پڑت ہے، ایسی رات ہوئے جی ماں[1] بھوت پریت ہمودن کی طرح درکھت پر سے ٹپکت ہیں۔"

یہ سنتے ہی سب کے سب چلا اٹھے۔ عورتوں نے اسے برا بھلا کہنا شروع کیا۔ مرد اسے سمجھانے لگے لیکن جس خیال کو بھگوان دین کے چچا نے ظاہر کیا تھا وہ سب کے دلوں میں موجود تھا۔ بے اختیار سب ڈراونے قصے سننے سنانے لگے اور جتنا ان کا ڈر بڑھتا تھا اتنے ہی زیادہ شوق سے سب قصہ سنتے۔ ایک پیاس سی سب کو لگ گئی جو پینے سے اور تیز ہوتی تھی۔

ایک نے پاس کے گاؤں کے ایک پہلوان کا قصہ سنایا۔ وہ ایک بہت بہادر آدمی تھا اور بھوت پریت کی کہانیوں پر ہنسا کرتا تھا۔ لیکن ایک مرتبہ جب وہ ایک باغ سے اندھیری رات کو گذرا تو کسی نے ایک درخت پر سے کہا:۔

"اب کی بچا اچھے پھنسیو[2]"

پہلوان سے لوگوں نے کہا تھا کہ بھوت پریت ناک سے بولتے ہیں اور یہ آواز بھی ویسی ہی تھی۔ مگر پہلوان کو پھر بھی یقین نہ آیا۔ وہ سمجھا کہ کوئی اسے ڈرانا چاہتا ہے اور اس نے للکار کر کہا:۔

"آؤ نکل آؤ۔ دیکھیں تم کا کرلے ہو۔"

اس کے بعد معلوم نہیں کیا ہوا۔ دوسرے دن ایک اہیر نے اُسے باغ

---

[1] جس میں۔

[2] پھنسے

کے کنارے پڑا پایا۔ اس کا چہرہ نیلا ہو گیا تھا۔ آنکھیں باہر گری پڑتی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ کسی نے اس کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ اسی کے پاس ایک ٹوٹی لاٹھی بھی پڑی تھی۔

سننے والوں نے "دیا رے دیا رے" کی صدا بلند کی۔ پیچھے پھر پھر کر دیکھنے لگے۔ ایک کو چھینک آئی تو سب کانپ گئے اور چلّا اٹھے۔ مگر یہ قصہ ختم ہی ہوا تھا کہ ایک بڈھا اپنی بیتی ایک کہانی سنانے لگا اور سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ بڈھے کی عمر کوئی ستر سال کی تھی اور وہ بولتے بولتے اکثر کھانسنے کھنکھارنے کے لئے رک جاتا تھا مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کا بیان اتنا اچھا تھا کہ سب سانس روکے سنتے رہے۔

بڈھے نے پہلے تو اپنی جوانی کا حال بتایا۔ وہ بہت تیز دوڑا کرتا تھا، اور کئی کئی میل ایک ہی رفتار سے جا سکتا تھا۔ آس پاس کے زمینداروں میں وہ ڈاک گاڑی کے نام سے مشہور تھا اور جب کبھی کوئی سندیس بہت جلد بھیجنا ہوتا تو وہ اسے بلایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ ایسے ہی کسی کام سے رات کو واپس آ رہا تھا۔ اندھیرے میں راستہ بھول گیا اور ایک کنج میں گھس گیا جہاں ایک بھوت رہا کرتا تھا وہ ایک درخت کے نیچے سے گذر رہا تھا کہ ایک بارگی اس کی نگاہ اوپر کی طرف اٹھ گئی اور اس نے دو گول گول زرد اور چمکیلی آنکھیں دیکھیں جو اسے گھور رہی تھیں۔ وہ چاہے جس کی آنکھیں رہی ہوں اس کو معلوم ہو گیا کہ کوئی اس پر جھپٹنے والا ہے اور وہ الٹا بھاگا جیسے وہ نیچے بھاگ رہا تھا ویسے ہی درختوں پر کوئی چیز اچکتی پھاندتی ہوئی اس کا پیچھا کر رہی تھی بھاگتے

بھاگتے وہ ایک کھلے میدان میں پہنچ گیا اور اسی وقت کسی نے ناک سے چلّا کر کہا:۔

"اب کی سار نکل گیو، بل[1] پھر کبھوں آیو تو گلا گھونٹ دیبا"

بڈھا خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد ہی کسی اور نے اپنی کہانی سنائی اور یوں ہی سلسلہ جاری رہا۔ بھوتوں کے ڈر نے سب کو ایسا بدحواس کر دیا تھا کہ وہ آگ میں لکڑی ڈالنا بھول گئے اور جب اس کا خیال آیا تو کسی کی جرأت نہ ہوئی کہ جا کر ادھر ادھر سے کچھ لکڑیاں بین لائے۔ ایک دوسرے کو للکارتے اور شرم دلاتے رہے لیکن معلوم ہوا کہ سب مجبور ہیں۔ وہ سب گویا کسی طاقت کے قبضے میں آ گئے تھے اور اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ آگ بجھتی گئی، اس کی گرمی کم ہونے لگی تو ایک دوسرے کو دھکے دے کر حلقے سے باہر نکالنے لگے۔ کچھ لوگ ان دھکیوں سے بچنے کے لئے ہمت کر کے اٹھ کھڑے ہوئے اور آپس میں گھر جانے کے مسئلے پر غور کرنے لگے۔ کوئی اکیلا جانے پر راضی نہیں تھا اور سب کے سب دور دور نہیں تو الگ الگ ضرور رہتے تھے مگر وہ بحث ہی میں مشغول تھے کہ ایک لڑکی کے ماتھے پر ایک سوکھی پتی آ کر لگی جسے ہوا کسی طرف سے اڑا لائی تھی۔ لڑکی چیخ اٹھی۔ جو لوگ جانے کے لئے کھڑے ہوئے تھے وہ سب بھاگ کر واپس آ گئے اور سب کے سب پھر آگ کے گرد کھڑے ہو گئے سردی اور ڈر سے سب کانپ رہے تھے۔ ہرنوں کے ایک غول کی طرح جسے شکاریوں نے گھیر لیا ہو کوئی ادھر بھاگنے کی صلاح دیتا تھا کوئی ادھر، لیکن دس

---

[1] بل: مگر

قدم چل کر سب پھر واپس بھاگ جاتے اور پھر ایک ہی جگہ پر جمع ہو جاتے۔

"اب بتاؤ" بھگوان دین نے منگل سے پوچھا "ای سب کون بھوت دیکھین رہن؟ سب آپے آپ تو ڈرات رہن"۔

منگل نے باوجود اپنی خفگی کے سارا قصہ بڑے غور سے سنا تھا اور اس کی بھی آخر کار وہی حالت ہو گئی جو قصے میں ان لوگوں کی تھی۔ درخت اسے کالے بھجنگ بھوت معلوم ہونے لگے۔ جھاڑیاں عجیب عجیب خوفناک جانور بن گئیں اگر آنکھیں کھولتا تو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں کچھ دکھائی نہ دے۔ اگر بند کرتا تو ٹھوکر کھانے کے علاوہ یہ ڈر تھا کہ کہیں اس پر کوئی اچانک حملہ نہ کر دے۔ اس کی کمر ٹیڑھی ہو گئی سر جھکر کھانے لگا۔ پیروں میں کپکپی آ گئی۔ بھگوان دین کی بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ اپنے آپ سے یہ پوچھا کہ یہ ڈر کس کا ہے اور کیوں ہے؟ بھگوان دین نے یہ دیکھ کر کہ منگل باتیں نہیں کرنا چاہتا اپنا مطلب سمجھانے کی اور زیادہ کوشش نہیں کی اور کسی سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دور وہ اسی طرح چلے تھے کہ منگل ایک مرتبہ ہی ہوئی آواز میں "ہائے رے" چلایا اور اچک کر بھگوان دین کے پیروں کے پاس گر پڑا۔ اس نے اتفاق سے کہیں آنکھیں پوری کھول لیں اور آگے سڑک کے پاس اسے ایک بڑا چتکبرا جانور پچھلے پیروں پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اس نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ وہ ایک جھاڑی ہے اور کچھ نہیں لیکن اندھیرے میں نہ حواس کہنا مانتے ہیں نہ تخیل۔ جب وہ چل کر ذرا اور پاس پہنچا تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ جانور اٹھ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ منگل نے پھر اپنے حواس درست کرنے کی کوشش کی، لیکن دماغ

میں جو تصویر بنی شروع ہوئی تھی وہ بنتی رہی۔ آنکھیں اس کی قریب قریب بند تھیں مگر اس پر بھی اسے دکھائی دیتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ جب وہ جانور کے برابر پہنچا تو جانور نے ایک چھلانگ ماری منگل اچک کر اپنے آپ کو بچانا چاہتا تھا مگر وہ صرف لڑکھڑا کر بھگوان دین کے پاؤں پر گیا۔

بھگوان دین خود گھبرا گیا۔ اس نے جلدی سے منگل کو اٹھا کر کھڑا کیا اس کے کپڑے جھاڑے اور پوچھا:۔

"یو تم کا بھلا ہوئی کا گو اجو آپے آپ گر پڑیو[1]"۔

منگل نے اِدھر اُدھر غور سے دیکھا اور جب اسے یقین ہوگیا کہ دراصل سب خیال ہی خیال تھا تو اسے بہت شرمندگی ہوئی اور اپنے اوپر غصہ بھی آیا مگر بھگوان دین کے سوال کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"بھئی دیکھو" بھگوان دین نے کچھ دیر انتظار کر کے کہا "تم پھر ایسا کرتے ہو تو ہم تم کا چھوڑ کے چلے جیبا[2]۔ تم تو ہم ہوں کا ڈرائے دے ہو"

"جاؤ چلے جاؤ۔ تم کا ہم کب روکے رہن" منگل نے سوکھے لہجے میں کہا "ہم کا تمرے بنا گھر نہ پہنچ پیبا[3]"

بھگوان دین کو منگل کی حرکت بہت ناپسند آئی تھی کیونکہ وہ سمجھ گیا کہ منگل آپ ہی آپ ڈر گیا تھا۔ اس کے بعد جب منگل نے بجائے اس کا احسان ماننے کے اور زبان درازی شروع کی تو وہ خفا ہوگیا اور ارادہ کر لیا کہ

---

[1] پڑے۔ [2] جائیں گے۔ [3] پائیں گے۔

منگل کو چھوڑ کر آگے نکل جائے گا لیکن کچھ قدم آگے چلنے کے بعد اسے رحم آگیا اور اس نے ارادہ بدل دیا۔ اب منگل کی باری تھی۔

"جاؤ جاؤ چلے کاہے ناہیں جات ہو!" اس نے دانت پیس کر کہا۔ جب اس نے دیکھا کہ بھگوان دین ٹھہر گیا "تم سار بدنام ہم کا کرت ہو اور ڈرا دت کھود ہو۔"

بھگوان دین اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"ہم پچاس بار رائے سڑک پر گئے ہیں۔ ہم کا کبھوں کچھ نہ دکھائی دیا، نہ ہم کبھو ڈرائن۔ آج بھگوان جانے ہم کا کا سوجھا جو تم جیسے نامردن کے ساتھ ہوئی لہن¹۔ کا کہن تمری بڑھیا کا کھیال آئی جات ہے نہیں تو گردن مروڑ کے تم کا ای نالی مال پھینک دیتیں۔ تم جیسے نامردے۔"

منگل پہلے تو بھگوان دین کو غور سے دیکھتا رہا۔ جب بھگوان دین نے گردن مروڑنے کی دھمکی دی تو اس سے نہ رہا گیا اور بھگوان دین نے اپنا جملہ ختم بھی نہ کیا تھا کہ اس نے گھما کر بھگوان دین کے ایک لاٹھی ماری، لاٹھی کنپٹی پر پڑی اور بھگوان دین چکر کھا کر گر پڑا۔ لیکن منگل نے اپنے وار کا نتیجہ نہیں دیکھا۔ لاٹھی مارتے ہی اس کے کانوں میں شور سا ہونے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا اور بغیر سوچے سمجھے وہ اس جگہ سے بھاگا۔ جتنا وہ تیز بھاگتا تھا اور جتنی دور وہ نکلتا جاتا تھا اتنا ہی اس میں اس کا احساس بڑھتا جاتا تھا کہ اس

---

¹ ہو لئے

کی حرکت کی خبر مشہور ہوگئی ہے۔ زمین، درخت، ہوا سب جان گئے ہیں اور اس کے لئے کوئی بچنے کا طریقہ نہیں ہے۔ کبھی ایک بارگی اسے سامنے ایک گڈھا نظر آتا، اور جب وہ اسے پھاند کر دوسری طرف پہنچتا تو معلوم ہوتا کہ کچھ بھی نہیں تھا۔ کبھی اس کے سامنے درخت کا درخت آکر کھڑا ہو جاتا اور جب وہ سمجھتا کہ بس اب ٹکر لگی اور سر پھٹا تو معلوم ہو جاتا تھا کہ سوائے ہوا کے کچھ نہیں۔ کبھی اسے خیال ہوتا کہ درخت، نالے نالیاں سب اس کے پیچھے دوڑے آرہے ہیں اور سب مل کر اس کا راستہ روک لیں گے۔ درختوں اور نالے نالیوں کی عداوت نے تو اس کے دل میں اتنی وحشت نہیں پیدا کی لیکن جب اُسے ایکبارگی وہ قصے یاد آتے جو بھگوان دین نے اسے سُنائے تھے تو اس کی ہمت جواب دے دیتی۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔

منگل بھاگتا رہا۔ کچھ دیر بعد جب اس کا دم ٹوٹ گیا تو اس نے اپنی رفتار کم کی اور اپنے آپ سے پوچھا کہ آخر جا کہاں رہا ہے۔ اتفاق سے وہ سڑک ہی پر جا رہا تھا اور کچھ سوچنے کے بعد اس نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ وہ گاؤں ہی کی طرف جا رہا ہے۔ لیکن اسی پر اسے یاد آگیا کہ آگے راستے پر درخت بہت گھنے ہیں اور سڑک کے دونوں طرف اونچے ٹیلے بھی ہیں۔ منگل نے پکا ارادہ کیا کہ اب بے کار کسی چیز سے نہ ڈرے گا۔ دل میں جو وہم باقی تھا اسے نکالنے کی کوشش کی، مگر دیکھا تو ہاتھ میں لاٹھی بھی نہیں تھی۔ واپس جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا۔

پہلے تو آہستہ آہستہ چلتا رہا اور اپنے اوپر قابو رکھا۔ لیکن پھر بھی ذرا

سی آہٹ ہوتی تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ ایک مرتبہ سڑک کے پاس ایک درخت پر کچھ آواز سی ہوئی تو اس نے اپنی چال تیز کر دی پھر یہ سوچ کر کہ اس رفتار سے چلا تو بہت دیر ہو جائے گی اس نے دوڑنا شروع کر دیا۔ دوڑتے دوڑتے اسے خیال ہوا کہ سڑک کے کنارے کچھ فاصلے پر ایک جانور کھڑا ہے اور اس نے مڑ کر غور سے دیکھا تو واقعی کتے کے قد کا کوئی جانور کھڑا تھا۔ منگل نے فوراً طے کر لیا کہ یہ بھیڑیے کے سوا کچھ نہیں اور پھر اسی طرح سے بدحواس ہو کر بھاگا۔ اگر اس نے اپنے پیچھے ایک نظر ڈالی ہوتی تو اسے معلوم ہو جاتا کہ جیسے وہ ایک طرف کو بھاگا تھا ویسے ہی لومڑی بھی دوسری طرف کو بھاگ گئی تھی۔ لیکن اس میں اب اتنی جرأت کہاں تھی۔

وہ اس قدر تھک گیا تھا کہ بے ہوش ہو کر گرنے والا تھا، مگر آخری وقت اس کو دور سڑک پر ایک لمبا سا جسم پڑا ہوا۔ دکھائی دیا منگل نے دیکھتے ہی پکارنا شروع کیا:۔

"بھگوان دین! بھگوان دین!!"

اس کے پکارنے سے پاس کے درختوں پر کچھ چڑیاں جاگ اٹھیں اور پر پھڑپھڑانے لگیں ......